cathy

مضمون نگاری

علامہ اخلاق دہلوی

شائع کردہ

کتب خانہ انجمنِ ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

قیمت مجلد ۳ روپے 3/50

طبع اوّل سنہ ۱۹۳۷ء ۵۰۰

طبع دوم سنہ ۱۹۵۱ء .... ایک ہزار

طبع سوم سنہ ۱۹۵۶ء .... ایک ہزار

طبع چہارم سنہ ۱۹۶۲ء .... ایک ہزار

طبع پنجم سنہ ۱۹۶۸ء .... ایک ہزار

ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو - اردو بازار دلّی

(محبوب المطابع برقی پریس دلّی)

۱۔ منظور شدہ ٹیکسٹ بک کمیٹی محکمہ تعلیم صوبہ دہلی ۲۴ ر فروری سنہ ۱۹۳۹ء سرکلر ۱۸۵

۲۔ مدخلہ نصاب ادیب فاضل (اردو آنرز) پنجاب یونی ورسٹی سولن (شملہ)

پراسپکٹس ص ۱۸ سنہ ۱۹۵۴ ۵۵ ۵۶ء

۳۔ مدخلہ نصاب ادیب کامل جامعہ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سنہ ۱۹۵۳ء

فہرست مضامین مضمون نگاری

اِنتساب

گلزارِ ادب کے ان تازہ رس پھولوں کو جو اس گُلِ رعنا کے اشتیاقِ دید میں فراہم کیے گئے ہیں جس کے رُخِ تاباں کا سنہری پرتو کشت زارِ دل کو گرما کر ادبی تخلیق کے لیے مستعد کرتا ہے۔ حسنِ قبول کی آرزو میں اُسی کے جاں فزا نام سے معنون کیا جاتا ہے۔

اخلاق

گفتنی ہایم برفت و کیسہ ام خالی بشد
بازمی باید کہ من آں ہفتخواں را سر کنم

اخلاق

بسم اللہ الرحمان الرحیم

دیباچہ

گل زارِ ادب کے تازہ رس پھول کیا ہیں؟ چوتھائی صدی کے ریاض کا ثمرہ مشق و مہارت کا نتیجہ۔ مطالعہ کی روح اور تجربات کا نچوڑ۔

آغازِ کار غالباً ۱۹۳۱ء کے آغاز میں مضمون نگاری کے زیرِ عنوان مختلف موضوعات پر میں نے اپنے دیرینہ تجربات قلم بند کرنے شروع کیے جو اسی زمانے میں اردو۔ ہندی۔ تعلیمی[لہ] رسائل و جرائد میں شیوع پذیر ہوئے اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھے گیے۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔

لہ ایجوکیشنل گزٹ جالندھر۔ دسمبر ۱۹۳۱ء مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی ۱۹۳۲ء ایجوکیشنل گزٹ الہ آباد۔ ستمبر ۱۹۳۲ء وغیرہ (اردو و ہندی) علوم مشرقی لاہور ۱۹۳۷ء وغیرہ۔

طبع اوّل بعدازاں یادش بخیر! میرے مشفق دوست پروفیسر محمد عبداللہ صاحب قریشی نے ۱۹۲۶ء میں ان اوراقِ پریشاں کو مجتمع کرکے کتابی شکل میں شائع کرایا جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اہلِ علم نے قدردانی فرمائی۔ موقر رسائل وجرائد[۱] نے ہمت افزا تبصرے شائع کیے۔ محکمہ ہائے تعلیم[۲] کے اربابِ حل وعقد نے طلبہ کے مطالعہ کے لیے منظور فرمایا اور یہ ذخیرۂ نگارش ہاتھوں ہاتھ شائقین کی نذر ہوگیا۔

ترمیم واضافہ اضافہ وترمیم کے زیور سے آراستہ کرکے اس مجموعۂ مضمون نگاری کو بارِ دگر طبع کرانے کی تیاری کی جاچکی تھی لیکن کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی کے باعث جو دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے مسلط تھی یہ ارادہ معرضِ التوا میں رہا۔

ہنگامۂ ہوش ربا ملک آزاد ہوا۔ آزادی کے متوالوں کی تمنائیں برآئیں۔ خیال تھا کہ اب اس کو دوبارہ طبع کرانے کی نوبت جلد آجائے گی کہ اچانک دہلی میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا اور قتل وغارت گری نے عرصۂ حیات تنگ کردیا۔ اور وہ کچھ ہوا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔

گلۂ جور نہیں۔ شکوۂ اغیار نہیں
یاں وہ بیتی ہے کہ بس قابلِ اظہار نہیں

---

[۱] رسالۂ اردو دہلی۔ ریاست دہلی۔ ہماری زبان دہلی۔ تیج دیگلی دہلی۔ وطن دہلی۔ راوی اور انصاری دہلی وغیرہ (تاریخ وغیرہ دستیاب نہ ہوسکیں) [۲] ٹیکسٹ بک کمیٹی محکمہ تعلیم صوبہ دہلی سرکلر نمبر ۱۸۵ مورخہ ۱۴ر فروری ۱۹۳۹ء ودیگر صوبہ جات کے محکمۂ تعلیم نے منظور کیا۔

بہرکیف ع ہرچہ آید برسرِ اولادِ آدم بگزرد۔
البتہ جو علاقے اِس آفتِ ناگہانی سے متاثر ہوئے۔ پہاڑ گنج ان میں خصوصیت کا حامل ہے۔ وہیں میرا مسکن تھا۔ جو سب پر بیتی وہی مجھ پر۔ اندھیر یہ ہوا کہ ظالم بلوائیوں نے جہاں میرا گھربار لوٹا۔ میرا بیش قیمت کتب خانہ بھی "تاخت و تاراج" کیا۔ جو میری زندگی کا آسرا۔ میرے بزرگوں کا اندوختہ۔ اور صدیوں کے بیش بہا نادرات کا ذخیرہ تھا۔ اور کچھ اس طرح "ملیٹ" کیا کہ ایک پرزہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔
اسی طوفانِ بدتمیزی میں اس کا وہ نسخہ بھی ضائع ہو گیا جو اضافہ و ترمیم کا حامل تھا اور یہ توقع بھی نہ رہی تھی کہ کبھی کچھ دستیاب ہو گا یا کبھی اشاعت کی نوبت آئے گی۔

نیک فال

ہنگامہ فرو ہونے لگا۔ حالات نے رُخ بدلنا اور اعتدال پر آنا شروع کیا۔ تو قضا عنداللہ اس کا ابتدائی مسودہ میرے ایک عزیز کے ہاں سے مجھے دستیاب ہوا جسے میں نیک فال سمجھا اور نعمتِ غیر مترقبہ جانا اور بہ حفاظت اپنے پاس رکھ لیا کہ۔ داشتہ آید بکار۔

وقت کا اقتضا

انجام کار وقت آیا۔ طلب پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے اصرار کی صورت اختیار کی۔ اور اگرچہ اب میں اس نایاب ذخیرے سے تہی دست تھا۔ جس کے سہارے اس گلزارِ ادب کی آبیاری اور چمن بندی کی تھی تاہم اس کے دھندلے نقوش ابھی تک سطحِ دماغ پر ثبت تھے۔

لہٰذا جو متداول کتابیں مجھے فراہم ہوسکیں از سرِ نو میں نے ان کا مطالعہ کیا۔ اور ظنیات کی تائید و تقویت کے لیے جابجا سے اقتباسات فراہم کیے اور اس طرح اس ہفت خوانِ نگارش کو از سرِ نو طے کیا ؎

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

الغرض ابتدائی مسودے کی بنیادی اصول میں جدید معلومات و تجربات کا اضافہ کیا اور اقتباسات سے اس کی تزئین کا کام لیا۔ جس سے یہ کتاب کایا پلٹ ہوگئی جو پہلے سے بہت زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

اِقتباسات اقتباسات سے ظنیات کو تائید ہوتی اور اختراعات کو تقویت پہنچتی ہے۔ مگر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اہلِ کمال کے رشحاتِ قلم سے متمتع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ کمال کس خوبی سے کسی مدعا کو ادا کرتے ہیں۔ نیز ان کے اسلوب کا مخفی سحر غیر ارادی طور پر ذوق کو ابھارتا اور فطری استعداد کو اجاگر کرتا ہے جس سے وہبی صلاحیت بروے کار آتی اور آمادۂ عمل کرتی ہے۔ اسی کے پیشِ نظر زیرِ مطالعہ کتاب میں جابجا اقتباس ملیں گے۔ جن سے ناظرینِ کرام لطف اندوز اور متمتع ہوں گے۔

تکمیل تصنیف و تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اغلاط کی بھرمار نہ ہو ورنہ "ایسی تحقیق جو خطا و سہو سے بری ہو شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔" چنانچہ جہاں تک میری کوشش کو دخل ہے۔ میں نے کوتاہی اور سہل انگاری سے

کام نہیں لیا۔ بلکہ مسائل کو سلجھا کر ادا کرنے میں اختصار و جامعیت اور اسلوب کی کارفرمائی کا لحاظ رکھا ہے۔ اور اہتمام کیا ہے کہ چھوٹی بڑی ضرورت کی کوئی شے نظر انداز نہ ہونے پائے۔

اب رہا یہ فیصلہ کہ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوں اور کہاں تک نہیں یہ ناظرین کے ہاتھ ہے ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

المختصر یہ ایک کوشش ہے۔ اور کوشش ہی کرتے رہنا زندگی ہے اگر حسنِ اتفاق سے یہ کارگر ثابت ہو۔ اور اس کو ادبیاتِ اردو میں اضافہ سمجھا جائے تو یہ نعم البدل اور خوش بختی ہے۔

وما علینا الا البلاغ المبین

اخلاق دہلوی
دہلی
۱۱ر مارچ سنہ ۱۹۵۱ء

لال محل
بستی حضرت نظام الدین رح
دہلی

مقصد

مضمون نگاری

قلم کی وساطت سے دل نشین انداز میں جذبات و
خیالات کے ادا کرنے کو مضمون نگاری کہتے ہیں

قدرت نے انسان کو محاسن و کمالات کا مرقع بنایا ہی۔ اور بعض صلاحیتیں ایسی عنایت فرمائی ہیں جنھیں تربیت دینے اور بروے کار لانے سے انسانی کمالات جگمگا اٹھتے ہیں اور انسان معراج کمال حاصل کر لیتا ہی۔

ان ہی میں سے ایک ملکہ مضمون نگاری جس کی مشق و مہارت سے خیالات اور جذبات کی ترجمانی میں مدد ملتی اور حسنِ قبول کی دولت نصیب ہوتی ہی۔ جو نہ صرف معاصرین کے لیے نفع بخش اور باعثِ افتخار ہی بلکہ آیندہ نسلوں اور قوموں کے لیے بھی موجبِ فلاح و بہبود ہی۔

اس میں شک نہیں کہ "دل سے جو بات نکلتی ہی اثر رکھتی ہی" مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ حسنِ ترتیب، لطافتِ زبان اور اندازِ بیان اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ چناں چہ دیکھا گیا ہی کہ ایک مصنف محض اپنی ایک تصنیف کی بدولت زمانے سے وہ خراجِ تحسین حاصل کر لیتا ہی۔ جو بادشاہِ ہفت اقلیم کو

میسر نہیں۔

یہی قدرتی صنّاع 'مضمون نگار' اپنی سحر کاری اور فسوں سازی سے لفظوں کے وہ گل کھلاتا، فقروں سے وہ نخل بندی کرتا اور حسنِ ترتیب سے وہ چمن آرائی دکھاتا ہے کہ ناظرین فرطِ مسرت سے اچھل اچھل پڑتے ہیں۔ امنگوں کے ولولے اور امید کی خوشیاں ان کا چلووں خون بڑھا دیتی ہیں۔

وہ کبھی اپنی قلم کاری سے لعبتِ ناز کا بناؤ سنگھار کرتا، نوک پلک سنوارتا اور جمالِ دل افروز کے وہ تقویٰ شکن مرقع بناتا ہے کہ زاہدِ صد سالہ بھی آمادۂ توبہ شکنی نظر آنے لگتا ہے۔

کبھی فقروں کی تراش خراش اور لفظوں کے توڑ جوڑ سے یاس و حرماں کی عکاسی کرتا ہے نامرادی کی سسکتی ہوئی لاشیں اور بے گور و کفن فلاکت زدہ تن بے جان دکھاتا ہے جن کے الم ناک نظارے سے غم و اندوہ کی سیاہ فام بدلیاں چھا جاتی ہیں۔ کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اور پڑھنے والے ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ہیں۔

کبھی دنیا کی بے ثباتی اور سفلہ پروری کا وہ درد انگیز نقشہ کھینچتا ہے کہ نخوت و کامرانی کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے دنیا سے دل بیزار اور اللہ ہی اللہ نظر آنے لگتا ہے۔

الغرض روتوں کو ہنسانا اور ہنستوں کو رلا دینا۔ رُوٹھوں کو منانا اپنوں کو بیگانہ اور بیگانوں کو اپنا کر دکھانا۔ دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنا دینا۔ شاہانِ ذی جبروت کے رعب اور دبدبے کو خاک میں ملا دینا۔ ان کے

جاہ و جلال کا سکہ بٹھا دینا۔ احساسات کو ابھارنا۔ جذبات کو بھڑکانا۔ خیالات کو برانگیختہ کرنا۔ دلوں پر ہیجان و اضمحلال کی کیفیت طاری کر دینا مضمون نگار کے بائیں ہاتھ کا کھیل اور ادنیٰ درجے کا کرشمہ ہی۔

چناں چہ ایک مصور، نقاش اور صنعت گر جو کام اپنی مصوری نقاشی اور صنعت گری سے لیتا ہی وہی کام یہ لفظوں کے ہیر پھیر اور بناؤ سنگھار سے کر دکھاتا ہی۔

اسی اعتبار سے ایک مضمون نگار اعلیٰ درجے کا مصور۔ نقاش اور بہترین صنعت گر ہی۔ وہ بے مثل ادیب، لائق مصنف۔ باکمال افسانہ نگار۔ معتبر مورخ نام آور مدیر، پسندیدہ ناول نویس۔ ناصح مشفق اور باخبر راہ نما ہو سکتا ہی۔

میر امن دہلوی۔ مرزا غالب۔ محمد حسین آزاد۔ خواجہ حالی۔ علامہ شبلی۔ پنڈت برج نرائن چکبست۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ لالہ سری رام (خم خانۂ جاوید) پنڈت رتن ناتھ سرشار عبدالحلیم شرر۔ راشد الخیری۔ مہاشے سدرشن۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور پنڈت برج موہن کیفی (دتا تریہ) .... آج کیوں روشناس عالم اور شہرہ آفاق شخصیت کے مالک ہیں۔ کیا اہلِ قلم اور مضمون نگار ہونے سے قبل ان کی یہی شہرت تھی اور یہی نام آوری اور یہی ہر دل عزیزی۔ نہیں نہیں حقیقت میں یہ اسی عطیۂ الٰہی کی برکت ہی جو مبدائے فیاض نے انھیں کرامت فرمایا اور انھوں نے اس سے کامل تمتع حاصل کیا۔

زمانے بدل جاتے ہیں طبقے اُلٹ جاتے ہیں۔ انقلابِ روزگار سے ملکوں۔ شہروں۔ قوموں اور خاندانوں کے نام و نشان نیست و نابود ہو جاتے

ہیں۔ مگر ایک مصنف، مضمون نگار اور انشا پرداز کا نام اسی طرح زندہ اور لوحِ قلوب پر مرتسم رہتا ہے۔

مثال کے طور پر سقراط و بقراط۔ افلاطون وارسطو۔ شیکسپیر و سعدی۔ سولن ابن رشد۔ کالی داس۔ امام غزالی۔ ابن بطوطہ۔ تلسی داس۔ اور میر و مرزا.....
.......کو دیکھیے کہ گردشِ روزگار سے زمین و آسمان بدل گئے۔ رجحانات کا رُخ پھر گیا۔ لیکن بلا امتیازِ قوم و ملت ایک عالم ان کا شیفتہ اور ان کے رشحاتِ قلم کا دل دادہ ہے۔ یہ اگر ان کی انشا اور نگارش کا ثمر نہیں تو کیا ہے۔ استاد ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

اس سے ظاہر ہے کہ مضمون نگار اپنے شاہ کار کی بدولت حیاتِ جاوید، شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے۔ جو حاصلِ حیات ہے۔

پھر کوئی وجہ نہیں کہ قدرت نے جنھیں یہ ملکہ عنایت فرمایا ہے وہ اس سے کام لیں اور کامیاب ہوں۔ البتہ کمال حاصل کرنے کے لیے عرق ریزی، اور جاں فشانی درکار ہے اور وہ بھی اصول و ضوابط کی پابندی کے ساتھ۔

کیا ہمارے نونہالانِ وطن اس ہفت خوانِ نگارش کو طے کرنے کے لیے کمربستہ ہیں؟ اگر ہیں تو یہ چیدہ اور منتخب اصول کا صحیفہ ان کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اسے اپنا دستور العمل بنائیں۔ عمل پیرا ہوں۔ اور تمتع حاصل کریں۔ ع

بنہ گام و کامیکہ خواہی بیاب

اصولِ نگارش

کس نے تکمیل کو پہنچائے نگارش کے اصُول
ہفت خواں کس نے یہ اخلاق سرانجام کیا

عنوان

ہر مضمون کے لیے ایک عنوان ہوتا ہی۔ عنوان کو موضوع اور سرخی بھی کہتے ہیں۔ عنوان کبھی ایک لفظ ہوتا ہی اور کبھی اس سے زائد۔ کبھی کوئی جملہ ہوتا ہی اور کبھی کوئی عبارت اور کبھی کوئی مصرع یا شعر بھی عنوان بنا لیا جاتا ہی۔

جس چیز کے متعلق خیالات قلم بند کیے جائیں اسی چیز کو عنوان کہتے ہیں۔ مثلاً موسم بہار یا برسات کے متعلق خیالات قلم بند کرنے اور ضبطِ تحریر میں لانے ہیں تو یہی اس کے عنوان قرار پائیں گے۔ بلکہ یہ بالکل بجا ہی کہ کائنات کی ہر شی ایک عنوان ہی۔

عنوان مضمون کے شروع میں نمایاں جگہ لکھا جاتا ہی۔ اور لبا اوقات جلی اور پُر کار قلم سے لکھا جاتا ہی۔ عنوان جاذبِ توجہ اور مختصر ہونا چاہیے۔

مشقی عنوانات نو آموز اور مبتدیوں کے لیے ابتدا میں سہل اور شگفتہ عنوانات مناسب ہیں بلکہ وہ عنوان زیادہ مفید ہوتے ہیں جن کے متعلق معلومات اکثر ان کے مشاہدے میں آتی رہتی ہی اور خیالات کا ذخیرہ ان کے دماغ میں محفوظ ہوتا ہی تاکہ عنوان انھیں بارِ خاطر نہ ہو اور

وہ بہ خوشی اپنے خیالات کو ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔ البتہ بتدریج قدم آگے بڑھاتے رہنا چاہیے تاکہ استعداد ترقی کرتی رہے۔

چناں چہ دیکھا گیا ہی کہ اس طرزِ عمل سے قلیل مدت میں معقول استعداد پیدا ہو جاتی ہی۔ اور ایک مبتدی مضمون نگار اچھے خاصے دقیق عنوانات پر اپنے خیالات قلم بند کر لیتا ہی۔ جو کام یابی کی دلیل ہی۔

عنوان کا حسن و قبح محققینِ ادب کی رائے ہی کہ عنوان کوئی اچھا یا بُرا نہیں ہوتا بلکہ جو عنوان مضمون نگار کے ذوق اور رجحان کے مطابق ہوتا ہی وہ اس کے لیے اچھا ہی اور جس سے طبیعت مانوس نہیں وہ اس کے لیے اچھا نہیں۔

البتہ کثرتِ مطالعہ اور مشقِ مضمون نگاری سے نگاہ میں ایسی وسعت اور خیالات میں ایسی گہرائی پیدا ہو جاتی ہی کہ اسے ادنیٰ سے ادنیٰ شے میں بھی حقیقت و فطرت کے سربستہ راز نظر آنے لگتے ہیں۔ اور وہ بعض سطحی اور نامانوس عنوانات کو بھی کیفیات و ذوقیات کی جلوہ گاہ بنا دیتا ہی۔ جنھیں دیکھ کر ناظرین محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ اور عش عش کرنے لگتے ہیں۔ سچ ہی

بر گِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ذیلی عنوانات جب کسی عنوان کے ماتحت تفصیلی معلومات فراہم کرنی ہوتی ہی تو سہولتِ کار کے لیے اس تفصیلی اور وسیع معلومات کو چند چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت مرتب کر لیا جاتا ہی۔ جو

اصل میں تفصیلی معلومات کے اجزا ہوتے ہیں اور ان ہی کو ذیلی عنوانات کہتے ہیں۔

ذیلی عنوانات سے مضمون نگار کو خیالات کے اظہار اور ان کی ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے۔ زائد از ضرورت جملے اور نامناسب محل خیالات خود بہ خود غمازی کرتے نظر آنے لگتے ہیں اور مضمون بہ آسانی حشو و زائد سے پاک و صاف کرلیا جاتا ہے جس سے مضمون کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔

ذیلی عنوانات کی مدد سے مضمون کو مختصر بھی کیا جاسکتا ہے اور اسے وسعت بھی دی جاسکتی ہے۔ خیالات کو سمیٹا بھی جاسکتا ہے اور حسبِ ضرورت پھیلایا بھی جاسکتا ہے۔ اور مضمون کا کوئی ضروری جز و نظرانداز بھی ہونے نہیں پاتا۔

مزید براں ذیلی عنوانات سے خیالات کی ترتیب اور معلومات کی تدوین میں جاذبیت اور خوش نمائی پیدا ہوجاتی ہے۔ جس سے وہ بہ یک نظر اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیتا ہے۔

جب یہ عنوان دائیں جانب کونے میں لکھے جاتے ہیں تو انھیں بغلی سُرخی کہتے ہیں اور یہ اصطلاح کاتبوں میں مروج ہے۔

الفاظ

الفاظ خیالات کی پوشاک اور آواز کے مادی پیکر ہیں وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں پُرشکوہ، باہیبت۔ نرم و نازک۔ درد انگیز اور مسرت افزا غرض کہ

خیالات کے ادا کرنے میں الفاظ کو بڑا دخل ہے۔ اور ان کا تفحص و تجسس اور برمحل استعمال مضمون نگاری کا جزوِ اعظم ہے علامہ ابن خلدون رقم طراز ہیں :۔

"انشا پردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں محض الفاظ میں ہے ......

معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں۔ اور اصل الفاظ ہیں ....

ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا

کیا جائے۔" [1]

خواجہ حالی فرماتے ہیں :۔

"معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ

کیے جائیں تو ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے اور ایک مبتذل

مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابلِ تحسین ہو سکتا ہے۔" [2]

البتہ مناسب الفاظ کے تفحص سے عہدہ برا ہونا آسان نہیں اس کے لیے بڑی کاوش اور دردِ سری درکار ہے۔ اور یہ بڑی کٹھن منزل ہے۔ اس سے عہدہ برا ہونے کے لیے الفاظ کی سیرت سے آگاہی، ان کے منصب سے واقفیت اور استعمال پر قدرت درکار ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں :۔

"الفاظ بھی انسان کی طرح جان دار ہیں وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے۔ مرتے۔ بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری خواجہ حالی صفحہ ۵ [2] ایضاً صفحہ ۵۱

رکھتا ہی جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہی وہ گزشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہی۔ وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا ہی اور قومی تزل کے ساتھ تنزل کرتا ہی۔

یہ بھی انقلابِ زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ ۔ شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہی لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہی اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہی جو اس کی سیرت سے آگاہ ہی اور یہ انشا پردازی کا بڑا گُر ہی۔" ؎۱

خواجہ حالی فرماتے ہیں:۔

"جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہی کہ ...... اپنے ہم جنسوں کے دلوں میں اثر پیدا کر سکیں۔ ان کو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہی اور اس کے اختیار کرنے اور ترک کرنے سے کیا خاصیت پیدا ہوتی ہی۔" ؎۲

کارلائل کی رائے ہی:۔

"جس شخص کو چھپے ہوئے حرفوں کا راز معلوم ہی وہ انھیں قوتِ آخذہ سے اپنا کر سکتا ہی صرف صدائے اصلی کی تلاش کا صحیح مذاق ہونا چاہیے۔" ؎۳

؎۱ تنقیدات عبدالحق ص ۱۲ ؎۲ مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۶ ؎۳ افادات مہدی ص ۱۹۹ مرتبہ مہدی بیگم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ان کی ساخت، ہیئت نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب و توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی.............................

لیکن میر صاحب کے اس شعر میں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزا ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کی بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے اس مصرع میں۔ ع

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

شبنم کی بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔"[۱]

دراصل الفاظ کا انتخاب اور ان کا استعمال ہی بڑی چیز ہے۔ جانچ پرکھ کر موقع محل سے کام لینا بڑا کمال ہے اور ایک سچا ادیب اور فطری مضمون نگار خوب جانتا ہے کہ کون سا لفظ کہاں استعمال کرنا چاہیے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض اوقات بعض ثقیل اور نامانوس الفاظ بھی محلِ استعمال کی خوبی سے لائقِ استعمال بن جاتے ہیں اور اُن سے عبارت

---

[۱] موازنۂ انیس و دبیر صفحہ ۲۳ و صفحہ ۲۴ مطبع مفید عالم آگرہ ۱۹۰۷ء۔

زور دار ہو جاتی ہے۔ مگر ایسے تصرفات صرف اساتذۂ فن ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔

الفاظ و اشباح بعض ماہرین نفسیات کی رائے ہے کہ بعض الفاظ میں واقعات کی ہیئت و شکل کو اذہان میں جلوہ گر کر دینے کی خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ الفاظ یا تو وہ ہوتے ہیں جن کے معنی مبہم اور مفہوم غیر متعین ہوتا ہے یا وہ ہوتے ہیں جو بچپن میں رٹوا دیے جاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر ان کی ہدایتوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور حزم و احتیاط کے ساتھ ان الفاظ کو استعمال کرنا خیالات کو برانگیختہ کرنے اور طبیعتوں میں ہیجان پیدا کرنے میں جادو کا اثر رکھتا ہے۔ چنانچہ عالم نفسیات **موسیو لی بان** کی مشہور کتاب کراوڈ کے ترجمے سے چند اقتباس درج ذیل ہیں جن سے ان کے مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

> وہ الفاظ جو اپنے اندر مقناطیسی قوت رکھتے ہیں ان کے متعلق یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی اس قوتِ تاثیر میں ان کے معنوں کو کبھی دخل نہیں ہوتا، بلکہ ان الفاظ کی ساحرانہ تاثیر درحقیقت مخفی ہوتی ہے۔ ان ذہنی اشکال اور صور کے اندر جو ان الفاظ سے ذہنِ جماعت میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جو ذہنِ جماعت پر زیادہ اثر کرتے ہیں۔ ان کے معنی اسی قدر زیادہ مبہم ہوتے ہیں۔ اور باوجود اس کے ان الفاظ کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ گو ان الفاظ کی حقیقت اور معنی اصطلاحی سے عوام ناآشنا ہوتے ہیں لیکن یہ الفاظ نفوس میں کچھ اس طرح گھر کر جاتے ہیں کہ ان کے متعلق لوگوں کو یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ تمام اجتماعی مشکلات کا حل ان ہی الفاظ کے

ساتھ وابستہ ہی۔" ۵۱

ان الفاظ کے متعلق بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہوجاتا ہی کہ ان الفاظ میں کوئی الٰہی طاقت مضمر ہی لیکن بات یہ ہوتی ہی کہ یہ الفاظ..... لوگوں کے ذہنوں میں ایسی ذہنی صورتیں اور اشکال پیدا کر دیتے ہیں جن کی کیفیت نہ معلوم ہوتی ہی۔ بزرگی اور عظمت ان کو ڈھانپے ہوتی ہی اور ابہام ان میں ایک مخفی قوت پیدا کر دیتا ہی۔ گویا کہ وہ معبود ہوتے ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں پڑتے اور نگاہوں سے اس طرح غائب رہتے ہیں کہ ان کی ہیبت و جلال سے زاہد کے بدن میں جھرجھری پیدا ہوجاتی ہی۔" ۵۲

نفوسِ جماعت پر صرف وہی الفاظ اثر کرتے ہیں جن کے اندر ذہنی صورتوں کے پیدا کرنے یا بالفاظ دیگر نفرت و رغبت کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی قوت مخفی ہوتی ہی اور جن کے اشارے پر قومیں آمادۂ عمل ہوجاتی ہیں یہ کلیہ دراصل تمام الفاظ کے لیے عام نہیں، بلکہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں گو ان ذہنی صورتوں کے پیدا کرنے

---

۵۱ روح الاجتماع ص۱۵۴-ص۱۵۵- مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۲ء
۵۲ روح الاجتماع ص۱۵۵- ایضاً

کی قوت پہلے مخفی تھی لیکن اب کثرتِ استعمال کے باعث اُن سے یہ قوت سلب ہوگئی اور اب وہ خالی آواز ہو کر رہ گئے جن کا اب سوا اس کے کچھ نہیں رہا کہ ان کو استعمال کرتے وقت ہمیں غور کرنے یا سوچنے کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑتی بلکہ اب ہم ان کی ہدایتوں پر بلا تکلف عمل کرتے ہیں۔ یہی بات ہے کہ بچپنے میں جو الفاظ بچوں کو رٹا دیے جاتے ہیں، ان سے گو وہ اثر پذیر تو نہیں ہوتے لیکن وہ ان الفاظ کی ہدایتوں پر ہمیشہ کاربند ہوتے ہیں۔" [۵۱]

اگر الفاظ اور جملوں کو حزم و احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ذہنِ جماعت میں صور و اشکال کا پیدا کر دینا بھی آسان ہوتا ہے۔ خاص کر جب الفاظ اور جملوں کا استعمال کرنے والا ازمنۂ سابقہ میں احتیاط و حزم کے ساتھ ان کا استعمال کرتا، تو اس کے معتقدوں کے دلوں میں اس کے الفاظ جادو کا اثر کرتے اور نفوسِ جماعت میں غیظ و غضب کی بجلی سی دوڑ جاتی، لیکن جب نفوس جوش اور غیظ و غضب سے پُر ہو جاتے تو اس وقت وہ پھر ان میں سکون کی حالت پیدا کر دیتا غرض اپنے حزم و احتیاط اور ہوشیاری کی بدولت اس کو اس قدر طاقت حاصل ہو جاتی کہ وہ جب چاہتا لوگوں کو رلا دیتا ہے اور جب چاہتا ان کو ہنسا دیتا۔" [۵۲]

---

۵۱ روح الاجتماع صفحہ ۱۵۶ ایضاً ۵۲ روح الاجتماع صفحہ ۱۵۲ ایضاً

یہ ہیں وہ خیالات جو علمائے لفظیات الفاظ کے متعلق رکھتے ہیں جن کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہی کہ الفاظ کو جانچ پرکھ اور تفحص و تجسس کے ساتھ برمحل استعمال کرنے سے اثر کا نشتر کارگر اور مضمون نگاری کا منشا پورا ہو سکتا ہی۔ حضرت اکبر (الہ آبادی) کیا خوب فرماتے ہیں ؎

اسی صورت میں دل کش خوبیٔ الفاظ ہوتی ہی
کہ حُسنِ یار کا پیدا کرے جلوہ معانی میں

مترادف الفاظ مترادف الفاظ زبان کا گراں قدر سرمایہ ہوتے ہیں ان کے معنیٰ کا نازک فرق جذبات و خیالات کے اظہار میں بہت معاون ہوتا ہی اور بسا اوقات جملے کی ساخت اور الفاظ کی نشست میں ان کی بدولت غیر معمولی حسن پیدا ہو جاتا ہی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں :۔

مترادفات کے نازک فرق۔ خیالات میں صفائی اور صحت بیان پیدا کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اور یہ بھی تو ایک فائدہ ہی کہ بار بار ایک لفظ کے اعادہ سے جو بیان میں بھدّا پن آ جاتا ہی وہ رفع ہو جاتا ہی۔ اور کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہی" [۱]

مزید فرماتے ہیں :۔

زبان کیسی ہی وسیع اور بھرپور ہو خیال کی گہرائیوں اور باریکیوں اور نازک فرقوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں قاصر رہتی ہی اور یہی

[۱] خطبات عبدالحق حصہ دوم ص۱۶۸ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۴۴ء۔

وجہ ہی کہ ان کے ادا کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے جاتے ہیں۔
مترادف الفاظ ایسے موقعوں پر بہت کام آتے ہیں۔ مترادف الفاظ
سب ہم معنیٰ نہیں ہوتے ان کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ ضرور
فرق ہوتا ہی۔ اس لیے ادائے مطالب میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی
ہی۔" [۵۱]

حضرت سائل دہلوی، مترادفات کے اس نازک فرق کو اپنے ایک شعر میں کس خوبی سے نظم فرماتے ہیں کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ ارشاد ہی ؎

لفظِ ہم معنیٰ بھی ہوتے ہیں مدارج میں جُدا
تیرے گھر آ کے میں خوش نود ہوں مسرور نہیں

مترادف الفاظ عموماً دوسری زبانوں سے کسی زبان میں داخل ہوتے ہیں اور یہ مضر نہیں بلکہ مفید اور وسعت و اضافۂ زبان کا باعث ہوتے ہیں اور خصوصاً اس لیے کہ کثرتِ استعمال سے ان کے معنیٰ میں نازک فرق پیدا ہو جاتا ہی۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں:-

مترادف الفاظ سے کوئی نقصان نہیں بلکہ زبان میں اضافہ
ہو جاتا ہی اور زبان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہی کہ ایک مدت
کے استعمال کے بعد مترادف الفاظ کے مفہوم میں خود بہ خود ایسے
نازک فرق پیدا ہو جاتے ہیں جن سے زبان کی لطافت بڑھ جاتی
ہی۔" [۵۲]

---

[۵۱] خطبات عبدالحق ص ۱۶۶ [۵۲] ایضاً ص ۱۶۶

بہرکیف الفاظ کی فراوانی اور خصوصاً ہم معنی الفاظ کی کثرت مدعا کے اظہار میں ممد و معاون ہوتی ہے اور جس مضمون نگار کو الفاظ کے اپنا لینے کا سلیقہ ہے وہ اس گر سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

دوسری زبانوں کے الفاظ

ایک ترقی کرنے والی زبان میں دوسری زبان کے الفاظ کا داخل ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جو ان تصرفات سے مبرا کہی جا سکے۔ مزید برآں اس نئے اضافے سے زبان کو نقصان نہیں کچھ نہ کچھ فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:۔

"بدیسی لفظوں سے زبان خراب نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے اس میں وسعت اور قوت اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔" [۵۱]

نیز لبا اوقات یہ الفاظ اپنی بدستور حالت پر برقرار نہیں رہتے بلکہ ان کی ہیئت و معنویت میں کچھ نہ کچھ تغیر ضرور ہو جاتا ہے اور زبان ان کو اپنی ساخت کے مطابق بنا لیتی ہے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں:۔

" ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو کر کبھی اصلی صورت پر قائم نہیں رہتے۔ اِلّا ما شاء اللہ ....

.... شاذ و نادر ہی ایسے الفاظ نکلیں گے جو اصلی صورت پر قائم ہوں۔" [۵۲]

مثلاً میّت بہ کسرۂ ی اور موسِم بہ کسرۂ س عربی لفظ ہیں۔ لیکن ہماری

---

[۵۱] خطبات عبدالحق صـ ۱۲۹-۱۳۰ [۵۲] مقدمہ شعر و شاعری صـ ۱۰۹۔

زبان میں بہ فتحہ ی اور بہ فتحہ س میّت اور موسّم مستعمل ہیں۔ اسی طرح عربی میں عرصہ بہ معنی میدان اور ہماری زبان میں بہ معنی مدت بہ کثرت مستعمل ہی۔ چناں چہ ایسے الفاظ کے استعمال کا دستور یہ ہی کہ زبان نے جس طرح اپنی ساخت کے مطابق بنا کر اپنا لیا ہی اسی طرح ان کو استعمال کرنا چاہیے۔ اصل تلفظ کے مطابق استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں:-

" ایسے لفظوں کو جو عربی فارسی یا انگریزی سے اردو میں لیے گئے ہیں۔ اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہیں۔ یہ سمجھنا ہی غلطی ہی کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں نہیں بلکہ ان کو اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں۔" [لہ]

یہ کلیہ عام ہی اور ہر مخلوط زبان میں رائج ہی۔ عربی، فارسی، اور انگریزی میں بہ کثرت اس کی نظریں ملتی ہیں۔ اردو میں بھی قدیم سے اس پر عمل درآمد ہی۔ چناں چہ اردو زبان کے مشہور مستند ادیب و شاعر سید انشاء نے اپنی موقر تصنیف دریائے لطافت (مرتبہ ۱۸۰۲ء / ۱۲۲۲ھ) میں اس موضوع پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہی۔ وہ فرماتے ہیں:-

" جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہو گیا خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی ترکی ہو یا سریانی۔ پنجابی ہو یا پوربی۔ اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہی۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہی تو بھی صحیح ہی اور

لہ مقدمہ شعر و شاعری ص۱۱

اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت و غلطی اس کے اردو میں
رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔ کیوں کہ جو چیز اردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل
میں صحیح ہو اور جو اردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے خواہ اصل میں صحیح بھی نہ
ہو۔" لہ

بہرحال دوسری زبانوں کے الفاظ کے اخذ و اختیار کے لیے یہ مسلمات ہیں جن سے ایک اہلِ قلم کو آگاہ ہونا چاہیے تاکہ حسبِ ضرورت ان سے استفادہ کیا جا سکے اور اس کی تحریر کو رسوخ و اعتماد حاصل رہے۔

ناقابلِ استعمال الفاظ

بعض لفظوں کے استعمال سے عبارت بدنما اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ یہ لفظ ادق، نامانوس، متروک یا ثقیل ہوتے ہیں۔ چناں چہ اس قسم کے لفظ عموماً استعمال نہیں کیے جاتے۔ ان سے پرہیز ہی بہتر ہے۔ البتہ اساتذۂ فن اپنے تصرفاتِ خصوصی کی بدولت ان کے استعمال کا حق رکھتے ہیں۔ اس باب میں میزان سخن [۲] کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

مختلف معنی میں الفاظ کا استعمال

بعض لفظ استعمال کی خوبی اور اسلوب کی کرشمہ سازی سے مختلف معنی میں استعمال کر لیے جاتے ہیں۔ تشبیہہ و استعارات بھی اسی کے ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ایک مستقل فن ہے جسے علمِ بیان کہتے ہیں۔ لہٰذا ایک مضمون نگار کو اس علم سے آگاہی اور الفاظ کے مجازی تصرفات سے واقفیت اشد ضروری ہے۔ اس مدعا کے لیے روحِ بلاغت کا مطالعہ نہایت مفید

لہ دریائے لطافت ترجمہ علامہ کیفی ص ۳۵۳۔ ۳۵۴ مطبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سنہ ۱۹۳۵ء

۲؎ میزان سخن، کتب خانۂ انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار دہلی سے دس آنے میں مل سکتی ہے۔

ہے۔ جو اس فن کی نہایت مختصر اور جامع کتاب ہے۔

البتہ اشتقاقِ صرفی سے آگاہی کے لیے علم صرف کی کتابوں کا مطالعہ مناسب ہے۔ اس کے لیے اچھا خلاصہ[1] (صرفی) سے مدد لینا کافی ہوگا۔

الغرض الفاظ سے متعلق جس قدر معلومات ہو سکے بہتر ہے تا کہ الفاظ کو محاورے اور روزمرہ کے مطابق خوش اسلوبی سے ادا کیا جا سکے۔ جو مضمون نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔

جملے اور فقرے

جملے پیکر خیالی ہیں۔ جملے چھوٹے چھوٹے، مختصر اور زبان کی فطری ساخت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے موثر ہوتے ہیں اور ان سے مفہوم بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

طولانی جملوں سے مفہوم صاف و دلکش انداز میں ادا نہیں ہوتا۔ ان میں تصنّع ہوتی ہے اور وہ پسند بھی نہیں کیے جاتے۔ اس لیے طولانی جملوں سے حتی الامکان پرہیز ہی بہتر ہے۔

مفہوم کبھی ایک جملے میں ادا ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زائد میں۔

بہر حال جملوں میں مفہوم و مدعا کو خوب سلجھا کر ادا کرنا چاہیے۔ تا کہ وہ براہ راست ناظرین پر اثر انداز ہو سکے اور یہ خوبی جملوں کی فطری ساخت اور علمِ معانی

---

[1] اچھا خلاصہ (صرفی) کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار دہلی سے بارہ آنے میں مل سکتا ہے۔ بہت کارآمد کتاب ہے۔

کی نکتہ آفرینی سے تعلق رکھتی ہے۔ جملے جس قدر مختصر، سلجھے ہوئے، روزمرہ اور محاورے کی بول چال کے مطابق ہوں گے۔ اتنے ہی دل کش اور موثر ہوں گے اور بعض بعض جملے قلم سے ایسے نکلیں گے جو ناظرین پر وجدانی کیفیت طاری کردیں گے۔ جو مضمون نگار کی کامیابی اور پختہ کاری کی دلیل ہے۔

جملوں کی ترتیب جملوں کی باہمی ترتیب۔ خیالات کی ترتیب کے مطابق ہونی چاہیے۔ تاکہ خیالات یکے بعد دیگرے دل و دماغ پر اثرانداز ہوتے رہیں اور مدعا کے افہام و تفہیم میں کوئی دشواری لاحق نہ ہو جملوں کی ترتیب میں ایسی لطافت اور دل ربائی ہونی چاہیے کہ بیک نظر دلوں کو موہ لے گویا کہ وہ جملے نہیں موتی کی لڑیاں ہیں۔

جملوں میں الفاظ کی ترتیب جملوں میں الفاظ کی ترتیب توازن و تناسب کے اعتبار سے موزوں، قواعد نحوی کے مطابق درست، بندشِ الفاظ چست اور نشست برمحل ہونی چاہیے خواجہ آتش نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

البتہ اقتضائے حال کے مطابق ترمیم بھی جائز ہے جو محاورے اور روزمرّہ کے خلاف نہ ہو اور جملے کی فطری ساخت پر بھی اثرانداز نہ ہو۔ بلکہ مدعا کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے میں ممد و معاون ہو۔

خیالات

انسان محشرِ خیال ہی۔ اس کے خیالات وافکار کی کوئی تھاہ نہیں انسان کے دل و دماغ پر خیالات کا ہجوم کچھ نہ کچھ ہر وقت رہتا ہی اور خصوصاً جب وہ کسی موضوع یا عنوان پر غور کرتا ہی تو جس طرح ایک تخم کی پیدایش کے ساتھ اس کے ارد گرد بکثرت خودرو گھاس اُگ آتی ہی بالکل اسی طرح اس کے ذہن میں بہت سے مختلف خیالات وافکار موج زن ہوتے ہیں۔ جو متعلق بھی ہوتے ہیں اور غیر متعلق بھی۔

خیالات کا انتخاب خیالات جو غیر متعلق ہوں انھیں خودرو گھاس کی طرح علاحدہ کر دینا چاہیے۔ ورنہ جس طرح اس گھاس پھوس سے پودے کی نشو ونما کو نقصان پہنچتا ہی۔ اسی طرح موضوع سے متعلق خیالات بھی ان افکارِ پریشان کے ہجوم میں کھو جاتے ہیں۔ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

موضوع سے متعلق خیالات بھی بعض اہم ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔ بعض بلند ہوتے ہیں۔ بعض متوسط اور بعض سطحی و معمولی۔ ان میں سے صرف ان خیالات کو منتخب کر لینا مناسب ہی جو مدعا کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے میں ممد و معاون ہوں۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ صرف بلند پایہ اور اعلیٰ درجے کے خیالات ہی موزوں اور جاذب توجہ ہوتے ہیں۔ اور سطحی یا متوسط درجے کے خیالات قابلِ التفات نہیں ہوتے بلکہ حقیقت یہ ہی کہ جو خیالات موضوع سے متعلق

جذبات کی ترجمانی اور کردار کی عکاسی کرتے ہیں وہی لائق انتخاب ہوتے ہیں۔

دراصل خیالات کے انتخاب کا معیار ان کی بلندی و پستی نہیں بلکہ ان کا موضوع سے متعلق ہونا ہی۔ چناں چہ بعض اوقات وہی خیالات مضمون نگار کا شاہ کار اور کلام بالی کا جزوِ اعظم قرار پاتے ہیں جو نہایت رکیک، پست اور از پا افتادہ ہوتے ہیں۔

ان ہی میں وہ خیالات بھی ہیں جو دل کی تہہ میں مخفی رہتے ہیں اور بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن جب کوئی کام یاب مضمون نگار اپنے قلم کی بوقلمونی سے انھیں ابھار ابھار کر دکھاتا اور خوش اسلوبی سے ادا کرتا ہی۔ تو پڑھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ ان ہی کے خیالات وجذبات کی ترجمانی ہی اور وہ ان سے بے انتہا لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہ بڑی ہنرمندی کی بات ہی۔

بعض اوقات مضمون کی توسیع کے لیے ان خیالات کو بھی شامل کر لیا جاتا ہی جو موضوع سے ادنیٰ سا بھی تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کو مدعا سے مربوط اور مفہوم سے قریب تر کر لیا جاتا ہی جو کمالِ فن کی دلیل ہی۔ مگر تا وقتے کہ کامل مہارت نہ ہو اس سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہی۔

لہذا ابتدائے مشق میں یہی مناسب ہی کہ ان ہی خیالات کو منتخب کیا جائے جو موضوع سے گہری وابستگی رکھتے ہوں اور جن کے فقدان سے مضمون ناقص و ناتمام سمجھا جائے۔

خیالات کی ترتیب خیالات میں ایک قدرتی ربط ہوتا ہی۔ اور اس ربط کا برقرار رکھنا مضمون نگار کے لیے ضروری

ہی۔ اگر خیالات میں ربط اور تسلسل قائم نہ رہے گا تو مضمون خیالاتِ پریشان کا گورکھ دھندا بن کر رہ جائے گا اور مدعا حاصل نہ ہوگا۔

خیالات کے مناسب تسلسل سے مفہوم و مدعا بہ آسانی ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہی۔ خیالات کے تسلسل کی کسوٹی ذوقِ سلیم ہی جو خود بہ خود راہ نمائی کرتا ہی اور بتاتا ہی کہ کس خیال کا تعلق کس سے ہی اور اسے کہاں اور کس خیال سے پہلے اور کس کے بعد لانا چاہیے۔ نیز عبارت میں ان الفاظ کی رعایت رکھنی ہوتی ہی جو باہم دگر ان کے تعلق و تسلسل پر دلالت کرتے ہیں۔

بلاشبہ یہ صحیح ہی کہ ابتدائی مشق کے دوران میں جب تک ذوق پختہ نہیں ہوتا خیالات کی صحیح نشست اور صحیح مقام کے سمجھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہی۔ اور ایک خیال کا رشتہ متعدد خیالات سے وابستہ معلوم ہوتا ہی۔ لیکن رفتہ رفتہ مشق و مہارت اور اس باب میں غور و فکر ذوق کو اجاگر کر دیتا ہی اور پھر کوئی دشواری نہیں رہتی۔ نیز ابتدا میں متناسب جملوں کا باہمی ربط قائم کر کے بار بار پڑھنے اور غور و فکر سے یہ مشکل حل ہو سکتی ہی۔

بہرحال خیالات کی ترتیب بہت اہم شی ہی۔ اور اسے پوری توجہ سے انجام دینا چاہیے۔

خیالات کا اظہار خیالات کو سلجھا کر دل کش انداز میں ادا کرنا چاہیے تاکہ ہر جملے سے ہر وہ خیال جو اس میں ادا کیا گیا ہی بہ خوبی ذہن نشین ہو سکے۔ اگر خیالات کو غور و فکر سے، سوچ بچار سے اور پوری طرح قابو پا کر جملوں میں ادا نہ کیا جائے گا تو وہ مفہوم کے اظہار میں قاصر

رہیں گے اور تحریر کا مدعا پورا نہ ہوگا۔

لہذا جہاں تک ہو سکے۔ خیالات کو پہلے ذہن میں خوب سلجھا لیا جائے اور پھر انھیں جملوں میں ادا کیا جائے اور جملے بھی مختصر اور روزمرہ کی بول چال کے مطابق ہوں اور ترتیب بھی مناسب ہو۔

خیالات کو مناسب طریق سے ادا کرنا بڑے کمال کی بات ہے جو دشوار بھی ہے اور ضروری بھی۔

اشارات

خیالات کی نیرنگیاں پناہ بخدا! ان کی وسعت کی کوئی حد ہے نہ انتہا انسان کے دل و دماغ پر ہمہ وقت ان کا طوفان سا بپا رہتا ہے اور جب کسی عنوان پر غور و خوض کیا جاتا ہے تو ان کا تموج اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ خیالات کے پرے کے پرے رونما ہوتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ اور ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ ان پر قابو پانا دوبھر ہو جاتا ہے۔

لہذا ان پر قابو حاصل کرنے کی سہل تدبیر یہ ہے کہ جو خیالات موضوع سے متعلق اور ضبط تحریر میں لانے کے لائق ہوں وہ تمام و کمال تو نہیں لیکن ان سے متعلق ایک آدھ لفظ یا کوئی جملہ بہ طور یادداشت قلم بند کر لیا جائے جو مضمون کو مرتب کرنے کے وقت ذہن کو پورے واقعہ یا مفہوم کی جانب منتقل کر سکے چنانچہ مضمون نگار عموماً اس تدبیر پر عمل کرتے اور کامیاب ہوتے ہیں۔

نیز اس مختصر یادداشت کو جو غور و فکر کے دوران میں قلم بند کی جاتی ہے اصطلاحِ مضمون نگاری میں **اشارات** سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اشارات کی مدد سے خیالات کو ترتیب دینے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ اور وہ سہولت سے مرتب ہوجاتے ہیں لہذا اس کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے بلکہ اس گُر سے کامل استفادہ کرنا چاہیے۔

پیراگراف

متناسب خیالات کے مجموعہ کو پیراگراف کہتے ہیں۔ جو دراصل مضمون کے اجزا ہوتے ہیں۔ جو خیالات کے تناسب و تعلق کے اعتبار سے مختلف حصّوں میں منقسم ہوتے ہیں۔

پیراگراف سے خیالات کے ربط کو سمجھنے اور انھیں ترتیب دینے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے مرتب ہوجاتے ہیں۔ نیز پڑھنے والوں کو بھی مفہوم و مدعا کے سمجھنے اور ذہن نشین کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اگر مضمون کو پیراگراف میں تقسیم نہ کیا جائے تو خیالات کا شیرازہ منتشر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہذا متناسب خیالات کے جملوں کو یک جا جمع کردینا اور پیراگراف بنانا ہی مفید ہوتا ہے۔

خیالات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بعض مختصر اور بعض طویل۔ جو مختصر ہوتے ہیں وہ عموماً ایک جملے میں ادا ہوجاتے ہیں۔ اور جو طویل ہوتے ہیں وہ ایک میں نہیں۔ کئی میں ادا ہوتے ہیں۔

بہرحال کسی طویل خیال کو کئی جملوں میں ادا کیا جائے اور اس کے ساتھ اس سے متعلق کئی جملے ہوں یا کسی مختصر خیال کو ایک جملے میں ادا کیا جائے اور اس کے ساتھ اس سے متعلق کئی جملے ہوں وہ سب ساتھ اور یکجا ہونے چاہئیں اور یہی ایک پیراگراف ہے۔

ہر پیراگراف کے پہلے جملے کو سطر کا ۸/۱ حصہ خالی چھوڑ کر شروع کیا جائے اور جب پورا مفہوم چند جملوں میں ادا ہو جائے تو اس کو وہیں ختم کر دیا جائے خواہ اس سطر کا کتنا ہی حصہ خالی رہے۔ تاکہ پیراگراف الگ معلوم ہو۔

پھر نئے پیراگراف کے پہلے جملے کو اسی طرح نئی سطر سے وہی ۸/۱ حصہ خالی چھوڑ کر شروع کیا جائے اور جہاں مفہوم پورا ہو اور پیراگراف مکمل ہو جائے حسب سابق وہیں ختم کر دیا جائے۔

الغرض مذکورہ امور کا لحاظ رکھتے ہوئے حسب ضرورت پیراگراف میں مضمون مرتب کر دیا جائے اور پیراگراف کی عبارت میں ان الفاظ کی رعایت رکھی جائے جو ایک پیراگراف کو دوسرے سے وابستہ رکھیں اور ایسے الفاظ عموماً ہر پیراگراف کے پہلے جملے کے آغاز میں لائے جاتے ہیں۔

بہرحال حتی الامکان مضمون کو ظاہری اور باطنی اوصاف سے آراستہ اور جاذبیت کی جلوہ گاہ بنا دینا چاہیے۔ تاکہ قبولِ خاص و عام کی نعمت نصیب ہو جو ماحصلِ نگارش ہے۔

مضمون کے اہم اجزا

ہر مضمون کے تین ضروری حصے ہوتے ہیں:۔

(۱) تمہید (۲) متن یا تفصیل (۳) خاتمہ

تمہید۔ مضمون کے آغاز میں ایسی عبارت لکھنے کو تمہید کہتے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے ناظرین کو مضمون کے پڑھنے کا شوق اور ضرورت محسوس ہو۔ تمہید کے لیے کبھی ایک جملہ کافی ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زائد۔ البتہ تمہید طویل نہ ہو۔ تمہید کا طویل ہونا بڑا عیب ہے۔ تمہید کا دلچسپ اور جاذب توجہ ہونا بہت اہم ہے۔ مضمون کی کامیابی و ناکامی کا دارومدار بہت کچھ اسی پر ہوتا ہے۔ لہٰذا حتی الامکان تمہید کے جملے جامع، مختصر اور دل آویز ہونے چاہئیں اور ان میں ایسی رعایت مخفی ہو کہ ان کے پڑھنے سے ذہن متنِ مضمون کی جانب بہ آسانی منتقل ہو جائے۔

متن۔ تمہید کے بعد اصل مضمون ہوتا ہے جسے متن مضمون کہتے ہیں۔ اس میں عنوان سے متعلق جملہ معلومات فراہم کی جاتی ہے۔ اس کو نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہی مضمون کی جان ہے۔ اگر خیالات کو دلچسپ انداز میں ادا نہ کیا گیا یا مناسب خیالات کو شامل نہ کیا گیا تو پورا مضمون ناقص رہتا ہے۔ اور محنت اکارت جاتی ہے۔

لہٰذا مضمون کے اس حصے کو مرتب کرنے کے دوران میں پورا اہتمام رکھنا چاہیے کہ خیالات کی ترتیب مناسب انداز میں ہو۔ کوئی ضروری شے ترک نہ

نہ ہونے پائے۔ اور خوش گوار اسلوب اختیار کرنے میں کوتاہی نہ رہے۔ غرض کہ یہ حصہ جس قدر جاذب اور مکمل ہوگا اتنا ہی مضمون کام یاب سمجھا جائے گا۔

خاتمہ ۔ مضمون کے آخر میں ایسی عبارت لکھنی جس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ مضمون ختم ہو چکا ہے۔ اسے خاتمہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے بھی کبھی ایک جملہ کافی ہوتا ہے اور کبھی اس سے زائد۔ لیکن خاتمہ طولانی ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

خاتمے کی عبارت مضمون کا نچوڑ اور اس کی روح ہوتی ہے۔ یہ بہت جامع اور موثر ہونی چاہیے تاکہ جن خیالات کو مضمون کے متن میں ادا کیا گیا ہے۔ ان کا اثر قائم رہے۔ اگر خاتمہ اچھا ہے تو اسے حسنِ خاتمہ کہتے ہیں۔

اقسامِ مضامین

مضمون مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ادبی۔ سیاسی۔ تاریخی۔ معاشی۔ اخلاقی مذہبی اور افسانوی .... لیکن سہولت کار کے لیے انہیں تین بڑے حصوں پر منقسم سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں:-

(۱) **بیانی** (۲) **تاریخی** (۳) **تخیئلی یا استدلالی**

(۱) **بیانی** ۔ میں شہر و قصبات کے حالات۔ سیر گاہوں کی کیفیت۔ میلے تہوار۔ حیوانات۔ نباتات اور مناظرِ قدرت وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) **تاریخی** میں سوانح حیات۔ تاریخی عمارتیں۔ تاریخی حادثات۔ جنگ و پیکار۔ انقلاب اور نظامِ مملکت وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) **تخیئلی یا استدلالی** میں اخلاقیات۔ مباحثے۔ مناظرے موازنہ و مقابلہ

وغیرہ شامل ہیں۔ اور ان میں منطقی براہین اور فکری استدلال سے کام لیا جاتا ہے۔

مضامین کی حدود

بعض مضامین کے ذیلی عنوانات ایک ہی قسم کے مضامین میں باہم مشترک اور بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے فقدان سے مضمون ناقص و ناتمام رہتا ہے اور ان مشترک عنوانات کو مضامین کی حدود سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان سے واقفیت بہ کار آمد اور ترتیبِ مضمون میں بہت مددگار ہوتی ہے۔ چناں چہ تمثیلاً چند مضامین کی حدود درجِ ذیل ہیں:-

بیانی مضامین

میلے اور تہوار۔ منانے کی وجہ۔ غرض و غایت۔ جگہ۔ تاریخ۔ منانے کا طریقہ۔ میلے کے مناظر۔ حصہ لینے والے ....

کھیل تماشے۔ وجہ۔ غرض و غایت۔ کھیل کے طریقے۔ حصہ لینے والے تماشائی۔ دیگر مناظر۔ نتائج۔ رائے عامہ۔ ....

سفر۔ مقام روانگی۔ وجہ۔ روانگی کی کیفیت۔ دورانِ سفر کے حالات مناظر۔ ہم سفر۔ منزلِ مقصود اور اس کا منظر ....

حیوانات۔ قسم۔ شکل و شباہت۔ عادت و خصلت۔ رہنے کے مقامات۔ فوائد۔ نقصانات ....

نباتات۔ تعریف۔ بناوٹ۔ پھول پھل اگر ہوں۔ موسم کے اثرات

استعمال۔ فوائد۔ نقصانات

مصنوعات صورت و ساخت۔ مختلف حصے۔ بنانے کا ڈھنگ ملنے کا مقام۔ استعمال اور موجد کے حالات۔

جمادات۔ شکل طبعی خواص۔ ملنے کے مقامات۔ اپنے مقام پر اس کی کیفیت۔ بعد کے عمل۔ استعمال۔

مناظرِ قدرت۔ محلِ وقوع۔ گرد و پیش کے حالات۔ منظر کی کیفیت علاقے پر اثرات۔ فوائد۔ نقصانات۔

مظاہرِ فطرت۔ ظہور کا موسم۔ ظہور کی کیفیت۔ خصوصیات۔ اثرات فوائد و نقصانات۔

موسم۔ ابتدا اور انتہا کا زمانہ۔ عروج کا موسم۔ نباتات۔ حیوانات اور انسان پر اس کا اثر۔ نتیجہ۔

تاریخی مضامین

(سوانح حیات)

مذہبی پیشواؤں کے حالاتِ زندگی۔ خاندان۔ سال و تاریخ ولادت مقامِ ولادت۔ بچپن۔ زمانے کی کیفیت۔ ماحول۔ تعلیمات۔ حلقۂ اثر متبعین (پیرو) ذریعۂ معاش۔ عادات و خصائل۔ وفات اور اس کے متعلقات۔

تاریخی اشخاص کے حالات۔ خاندان آبا و اجداد۔ تاریخ ولادت مع سال۔ مقامِ ولادت۔ بچپن۔ وضع قطع۔ صورت و شکل۔ زمانے کے حالات

تعلیم۔ ذریعۂ معاش۔ اوصاف۔ کمالِ فن۔ کارنامہ۔ وفات مع متعلقات۔

اہلِ قلم کے حالات۔ خاندان۔ آباؤ اجداد۔ تاریخ ولادت……
مقامِ پیدائش۔ بچپن۔ ماحول۔ تعلیم وتربیت۔ عادات وخصائل۔ وضع قطع۔ صورت وشکل۔ ذریعۂ معاش۔ زمانے کے حالات۔ رشحاتِ قلم۔ اسلوبِ بیان۔ کلام کا نمونہ۔ کلام کے اثرات۔ زندگی کے اہم واقعات۔ وفات اور اس کے متعلقات۔

بادشاہوں کے حالات۔ خاندان ابتدائی زندگی۔ تخت نشینی۔ مدت سلطنت۔ اخلاق وعادات۔ طرزِ حکومت۔ ملکی حالات۔ عہدِ حکومت کے مشہور واقعات۔ لڑائیاں۔ ایجادات۔ مشہور اشخاص اور ان کے اوصاف۔ پبلک کی کیفیت۔ تجارتی حالات۔ وفات ومدفن۔ یادگاریں۔

موجدوں کے حالات۔ خاندان۔ تاریخ ولادت۔ بچپن۔ ایجاد کے اسباب۔ ابتدائی کوششیں۔ کامیابی وناکامی۔ یادگار۔ وفات۔

تاریخی واقعات۔ تاریخ وقوع۔ وجہ۔ اچھے بُرے پہلو۔ لوگوں کے حالات۔ حکمران کے حالات۔ نتائج۔

جنگ وپیکار۔ سبب۔ فریقین۔ مقام۔ تاریخ۔ نتیجہ۔ اثر۔ بہادری کے کارنامے۔ نام ورمقتولین۔

تاریخی عمارات۔ نام اور بانی۔ محلِ وقوع۔ حدودِ اربعہ، وسعت اور وضع قطع۔ تاریخِ تعمیر اور غرض وغایت۔ خرچ کا اندازہ۔ دیگر حالات۔

خاص خاص مقامات۔ نام اور وجہ تسمیہ۔ محلِ وقوع اور حدودِ اربعہ

قدرتی خد و خال۔ اور آب و ہوا۔ وسعت۔ باشندوں کے عادات و اطوار اور پیشے۔ قابلِ ذکر حصے۔ اور خاص خاص چیزیں۔ دیگر خاص حالات۔

تخیلی مضامین

مناظرے اور مباحثے۔ طرفین کی تعریفیں۔ طرفِ اول کے دلائل۔ طرفِ ثانی کے دلائل، نتائج۔ دیگر امور۔

موازنے اور مقابلے۔ افراد یا اشیا کی مختصر کیفیت۔ طرفین کے دلائل۔ فوقیت۔

اخلاقیات۔ تعریف۔ دلائل۔ تمثیلات۔ نتائج۔

معاشیات۔ تعریف۔ اصول و قواعد۔ فوائد و نقصانات۔

سماجیات۔ تعریف۔ موافق و مخالف دلائل۔ تمثیلات۔ نتیجہ۔

ادبیات۔ تعریف و معنیٰ۔ اقسام۔ ضرورت۔ فوائد۔ نقصانات۔ تمثیلات۔ اثرات۔ ماحول۔ نتیجہ۔

یہ حدود کا خاکہ ہے جس کی راہ نمائی سے مضامین کی حدود متعین کی جاسکتی ہیں مگر اس سے یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ صرف یہی حدود ہیں جو لکھ دی گئی ہیں۔ بلکہ ان کی روشنی میں حسبِ ضرورت کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔

مضمون لکھنے کے طریقے

پہلا قاعدہ

سوالات سے مضمون کی تیاری۔

کم سن نوآموز یا وہ مبتدی جنھیں ابھی تک مضمون نگاری سے سابقہ نہیں پڑا۔ اوران کے دماغ میں معلومات کا ذخیرہ فراہم نہیں اور وہ کسی عنوان پر غور و خوض کے عادی نہیں۔ ان کے لیے سہل تدبیر یہ ہے کہ ابتداً ان سے موضوع سے متعلق سوالات کیے جائیں اور جو جواب وہ دیں ان ہی سے ان کو ترتیب وار لکھوا دیا جائے۔ ان کے لیے وہی ایک مختصر مضمون ہو جائے گا اور چوں کہ اس تدبیر سے مبتدی پر زیادہ بار نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہ اس کام یابی سے فرحت محسوس کرے گا۔ اس لیے مضمون نگاری سے اس کی طبیعت ابانہ کرے گی۔ بلکہ شوق بڑھے گا اور ترقی کرنے کے جذبات برانگیختہ ہوں گے جو کام یابی کا پیش خیمہ ہے۔

تمثیلی مضمون

گائے

(سوالات)

(۱) گائے کسے کہتے ہیں؟ (۲) گائے پالتو جانور ہے یا جنگلی؟ وہ پرند ہے یا چوپایہ؟ (۳) گائے نر ہے یا مادہ؟ اور کس کی مادہ ہے (۴) اس کا رنگ

کیسا ہوتا ہی۔ (۵) وہ کیا دیتی ہی (۶) دودھ کس کام آتا ہی (۷) اس کا دودھ فائدہ مند ہی یا نقصان دہ؟ (۸) وہ کیا کھاتی ہی؟ (۹) اسے اور بھی کچھ کھلایا جاتا ہی یا نہیں؟ (۱۰) دانہ اور کھل کھلانے سے کیا فائدہ؟ (۱۱) گائے مرکھنی ہوتی ہی یا نہیں؟

جوابات
گائے

گائے ایک قسم کا جانور ہی۔ وہ پالتو جانور ہی اور چوپایہ ہی۔ وہ نر نہیں مادہ ہی اور وہ بیل کی مادہ ہی۔ اس کا رنگ سفید ہوتا ہی۔ وہ دودھ دیتی ہی۔ اور اس کا دودھ پینے کے کام آتا ہی اور وہ بہت مفید ہوتا ہی۔ وہ گھاس پھونس کھاتی ہی۔ اسے دانہ اور کھل بھی کھلاتے ہیں۔ دانہ کھلانے سے دودھ بڑھتا ہی۔ اور کھل کھلانے سے دودھ گاڑھ ہوتا ہی۔ عموماً گائے مرکھنی نہیں ہوتی۔ وہ بہت غریب جانور ہی۔

اسی طرح بہت سے سوالات کیے جا سکتے ہیں۔ اور ان کے جوابات سے مضمون کو بڑھایا جا سکتا ہی۔ البتہ ترتیب میں حروفِ عطف کا اضافہ کرنا پڑتا ہی۔

الغرض رفتہ رفتہ استعداد کو ترقی دیتے رہنے اور غور و فکر کی مشق کراتے رہنے سے قلیل مُدت میں خود مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہی۔

دوسرا قاعدہ

جب کسی مبتدی میں اتنی استعداد ہو کہ وہ خود سوالات کر سکے تو اسے موقع دینا چاہیے اور اسی سے سوالات کرانے چاہئیں۔ اور سوالات کو لکھوا دیا جائے بعد ازاں جوابات دریافت کیے جائیں۔ اور حاصل کردہ جوابات کو ترتیب سے لکھوا دیا جائے۔ یہی اس کے لیے ایک مختصر مضمون بن جائے گا۔

البتہ بتدریج اس کو بھی غور و فکر کا عادی بنایا جائے اور اس کی استعداد کو ترقی کرنے کے مواقع دیے جائیں۔ اس طرح بہت جلد اس میں خود مضمون لکھنے کی جرأت پیدا ہو جائے گی اور کامیابی حاصل ہو گی۔

تیسرا قاعدہ

پہلے سوچو پھر لکھو!

متوسط درجے کے مضمون نگار جن کے دماغ کسی قدر تربیت یافتہ ہوں اور معلومات کا ذخیرہ بھی رکھتے ہوں ان کے لیے یہ تدبیر کارآمد ہے کہ جس عنوان پر انھیں لکھنا ہے۔ پہلے وہ کچھ دیر اس کے متعلق غور و خوض کریں۔ اور اس کے ہر پہلو پر نظر ڈالیں اور سوچیں کہ اس عنوان کے تحت کیا کیا لکھا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ غور و فکر کے دوران میں خیالات کا ہجوم بڑھ جائے گا جن میں سے کچھ موضوع سے متعلق ہوں گے اور کچھ نہیں۔ جو متعلق نہیں انھیں بیک نظر قلم زد کر دینا چاہیے۔ اور جو متعلق اور کارآمد ہوں انھیں منتخب کر لینا چاہیے اور چوں کہ فی الوقت تمام و کمال خیالات کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یادداشت کے طور پر کچھ اشارات لکھ لینے چاہئیں۔

اس تدبیر سے دماغ کا بار ہلکا ہو جاتا ہے اور اسے مزید غور و فکر کا موقع مل جاتا ہے۔ اور وہ کچھ اور معلومات فراہم کر دیتا ہے۔ اور اس طرح موضوع کے تمام پہلو پیشِ نظر آ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ چیزیں بھی سامنے آ جاتی ہیں جو دماغ کے پردوں میں پنہاں اور قلب کی پنہائیوں میں روپوش ہوتی ہیں۔ اور جو مضمون کی جان سمجھی جاتی ہیں۔

بہرحال جب اس طرح اشارات جمع ہو جائیں تو سلیقے سے مضمون مرتب کر لینا چاہیے۔ یہ صورت مفید بھی ہے اور بہ کار آمد بھی اور عموماً عمل درآمد بھی اسی پر ہے۔

مضمون کی تدوین

(تفصیلی طریقۂ کار)

موضوع پر غور و فکر اور اشارات کو قلم بند کرنے کے بعد۔ ان میں سے پہلے ذیلی عنوانات الگ کر کے انھیں ترتیب دے لینا چاہیے۔ بعد ازاں ان میں سے ہر ایک کے تحت ان سے متعلق اشارات لکھے جائیں اور انھیں بھی مناسب طریق پر ترتیب دے لیا جائے۔

جب اس طرح خاکہ تیار ہو جائے تو اس کی مدد سے خیالات کو خوب سلجھا کر اور نہایت احتیاط سے الفاظ میں ادا کر دیا جائے۔ خیالات کو الفاظ کا لباس پہنانا اور ان کے لیے مناسب جملوں کی تلاش کر لینا بڑے صبر و تحمل کا

کام ہی اور اگرچہ اس میں وقت لگتا ہی لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔

غرض کہ اشارات کی مدد سے ہر ذیلی عنوان کے تحت نہایت سلیقہ مندی سے ضروری معلومات فراہم کر دینی چاہییے۔ اور یہ کام جتنی احتیاط سے انجام دیا جائے گا مضمون اتنا ہی زیادہ قبولیت حاصل کرے گا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں:-

"ہمیشہ وہی ...... زیادہ مقبول اور زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہی۔ جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا۔ ہو" [۱۵]

مضمون کی تدوین میں جلد بازی بہت مضر ہوتی ہی۔ کیوں کہ دیکھنے والے اس سے غرض نہیں رکھتے کہ وقت کتنا صرف ہوا ہی اور کتنا نہیں بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ مضمون کیسا ہی اور کیسا نہیں۔ اگر مضمون محنت سے مرتب کیا گیا ہی تو منکر سے منکر کو بھی ایمان لانا اور تسلیم کرنا پڑتا ہی اور اس کے برعکس ہی تو دوست بھی داد نہیں دیتے۔

مضمون کی تدوین کا کام بہت اہم ہی اور بہت کٹھن ہی ایک ایک لفظ کے لیے جان کھپانی پڑتی ہی۔ اور اسے خون جگر سے سینچنا پڑتا ہی۔ بہرحال اس مرحلے کو نہایت احتیاط اور کامل پرداخت سے سرانجام کرنا چاہییے۔

چوتھا قاعدہ

مضمون نگاری کا چوتھا قاعدہ یہ ہی کہ عنوان پر کچھ دیر غور و خوض کر لیا جائے اور دل ہی دل میں خیالات کو ترتیب دے لیا جائے۔ بعد ازاں قلم بند کیا جائے

---

[۱۵] مقدمہ شعر و شاعری ص ۴۸

توچوں کہ معلومات بالترتیب دماغ میں موجود ہوگی اس لیے وہ بہ سہولت مرتب ہوجائے گی۔ لیکن یہ بہت مشّاقی اور مہارت کا کام ہی۔ اس لیے اس پر عمل بہت کم کیا جاتا ہی۔

البتہ قلتِ وقت یا چند سطری معلومات قلم بند کرنے کی صورت میں یہ قاعدہ مستعمل ہی۔ مگر ایسی تحریریں حیاتِ جاوید اور قبولِ خاطر کی نعمت سے محروم رہتی ہیں۔

تہذیب و تنقیح
یا
نظرِ ثانی

مضمون خواہ کتنی ہی کاوش و کوشش سے مرتب کیا جائے لیکن خیالات پر قابو پانا اور خوش اسلوبی سے جملوں میں ادا کرنا چوں کہ بہت کٹھن ہی اس لیے کسی نہ کسی سقم کا رہ جانا کوئی تعجب خیز امر نہیں۔

لہذا اس قسم کی فروگزاشت کو رفع کرنے کے لیے تہذیب و تنقیح، نقد و نظر اور بار بار نظر ڈالنے کی سخت ضرورت ہی۔ علامہ ابن رشیق کتاب العمدہ میں رقم طراز ہیں:۔

جب .... سرانجام ہوجائے تو اس پر بار بار نظر ڈالنی چاہیے۔
اور جہاں تک ہوسکے اس میں خوب تنقیح و تہذیب کرنی چاہیے۔ پھر

بھی اگر .... جودت اور خوبی پیدا نہ ہو تو اس کے دور کرنے میں
پس و پیش نہ کرنا چاہیئے .... اگر اس کے دور کرنے میں مضائقہ
کیا جائے گا تو ایک (فقرے) کے سبب سارا کلام درجۂ بلاغت
سے گر جائے گا۔" ۵۱

خواجہ حالی فرماتے ہیں:-

جس قدر .... زیادہ بے ساختگی اور آمد معلوم ہو اسی قدر
جاننا چاہیے کہ اس پر زیادہ محنت اور غور اور زیادہ حک و اصلاح
کی گئی ہوگی"۔ ۵۲

گویا کہ مضمون کے تیار ہو جانے کے بعد بھی اس کو اس نظر سے بار بار پڑھنا کہ جو نقائص رہ گئے ہیں ان کو رفع کر دیا جائے، بے حد ضروری ہے اور جہاں تک ممکن ہو یہ عمل پیہم اور متواتر جاری رکھنا چاہیے۔

اگر دماغ کو آرام دینے کے لیے بار بار کی نقد و نظر کے درمیان کچھ وقفہ بھی ہو تو بہتر ہے۔ کیوں کہ بعض مطالب ذہن میں ایسے راسخ ہو جاتے ہیں کہ ان کے نقائص و معائب فی الوقت محسوس نہیں ہوتے اور جو ہوتے بھی ہیں ذہن ان کا بدل پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ البتہ جب دماغ آرام پا لیتا ہے تو محسوس ہونے والے نقائص کا بدل پیش کر دیتا ہے۔ اور نظر ان غلطیوں کو پکڑ لیتی ہے جو پہلی خواندگی میں نظر انداز ہو گئی تھیں۔

بہر حال ایک ایک لفظ کو جانچنا، ایک ایک جملے کو پرکھنا اور ایک ایک

---

۵۱ مقدمہ شعر و شاعری ص ۵۰ ۵۲ ایضاً ص ۵۰

خیال کو ٹٹولنا اور ان کے باہمی ربط اور گرد و پیش کے اثرات کا جائزہ لینا جستہ زدائد۔ اعتدالِ مبالغہ۔ روزمرہ و محاورہ غرض کہ جملہ محاسن و معائبِ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے حک و اصلاح اور تہذیب و تنقیح کا عمل جاری رکھنا ہوتا ہے۔ اور ایک ایک لفظ میں روحِ حیات پھونکنا۔ ایک ایک جملے میں جان ڈالنا اور ایک ایک خیال کو پیکرِ زندگی بنانا پڑتا ہے۔ اور خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ جب جاکر کہیں مضمون نگاری کا حق ادا ہوتا ہے اور مضمون معراجِ قبول حاصل کرتا ہے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں :-

"جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں ندرت اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو اور جس قدر اس میں صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اس کی صفائی اور کاٹ چھانٹ میں دیر لگی ہے۔" ۵۱

الغرض مضمون کی صفائی اور درستی میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا جائے اور پوری عرق ریزی اور تن دہی سے اس مرحلے کو طے کیا جائے کیوں کہ جس قدر اس میں جان کھپائی جائے گی مضمون میں اسی قدر دل آویزی پیدا ہوگی۔ چنانچہ اب تک جتنے نام آور ادیب اور اہلِ قلم گزرے ہیں اور ان کے جو مسودات دستیاب ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا وہ کلام جو نہایت شستہ اور بے ساختہ ہے وہ انتہائی کاٹ چھانٹ

۵۱ حیاتِ سعدی ص ۸۱ محمدن پریس علی گڑھ ۱۸۹۶ء

اور حک و اصلاح کا نتیجہ ہی۔ اس میں تامل روا رکھنا اور پس و پیش کرنا اپنی کوشش کو ضائع کرنا ہی۔

تنقیح طلب نقائص

نظر ثانی میں جن امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہی۔ انھیں یہاں تفصیل سے درج کرنا...... بے محل نہ ہوگا وہ ایک مستقل موضوع ہی اور اس پر متعدد کتابیں دستیاب ہوتی ہیں[۵۷]۔ البتہ بہ قدر ضرورت چند اہم امور درج ذیل ہیں۔ جن کا نظر ثانی میں لحاظ رکھنا ضروری ہی:-

(۱) مطالعہ اور معلومات کی کمی۔
(۲) الفاظ کے انتخاب اور ترتیب کی کوتاہی۔
(۳) جملوں کے انتخاب اور ترتیب میں نقص۔
(۴) خیالات کے انتخاب اور ترتیب و تسلسل میں قصور۔
(۵) الفاظ اور جملوں کا صرفی اور نحوی پایۂ اعتبار۔
(۶) اجزاے جملہ کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر۔
(۷) خیالات کی ناہمواری۔ کہیں سنجیدہ اور کہیں فرسودہ اور از کار رفتہ
(۸) عبارت کی ناہمواری۔ کہیں اختصار اور کہیں طوالت۔ کہیں سادہ۔ اور کہیں ادق۔ اور کہیں رنگین۔
(۹) علاقۂ طوالی۔ خیالات کے سلسلے میں سے کسی کڑی کا کم ہونا جس سے

۵۷ میزان سخن اس موضوع پر مختصر اور جامع کتاب ہی۔ قیمت ۱۰ / دس آنے

مفہوم کے سمجھنے میں دشواری ہو۔

(۱۰) تعقید۔ عبارت کے ردوبدل سے مفہوم کا کچھ سے کچھ سمجھا جانا۔

(۱۱) حشو وزوائد۔ زائد از ضرورت لفظوں یا جملوں کا ہونا۔ جن کی کمی سے اظہارِ مدعا میں کوئی نقص واقع نہ ہو۔

(۱۲) مترادف الفاظ کی کثرت اور بھرمار۔

(۱۳) توالی اضافات۔ اضافتوں کی کثرت اور زیادتی۔

(۱۴) مبالغہ۔ جو اعتدال سے متجاوز ہو اور قرینِ قیاس نہ ہو۔

(۱۵) خلافِ محاورہ۔ بعض ان الفاظ کا استعمال جو صحیح تو ہوں لیکن محاورے اور روزمرہ کی بول چال کے خلاف ہوں۔ ادق ثقیل اور متروک الفاظ اسی مد میں آتے ہیں۔

(۱۶) مؤثر عبارت کی کمی۔

(۱۷) متضاد خیالات کا اجتماع۔

(۱۸) ناظرین کے رجحان اور مذاق کی رعایت نہ ہونا۔

(۱۹) تجربے یا مشاہدے کے خلاف کسی خیال کا ہونا۔

(۲۰) حک و اصلاح اور نظرِ ثانی میں غفلت برتنا یا جلد بازی کرنا۔

(۲۱) تدوین میں کوتاہی یا سہل انگاری۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے مضامین و مقالات شاذ و نادر ہی ہونگے جو خطا و سہو سے بری ہوں۔ اسی سبب سے یہ زیادہ اہم ہے کہ تنقیح و تہذیب اور حک و اصلاح میں زیادہ جان کھپائی جائے اور توجہ مرکوز کی جائے اور

کوتاہیوں کو رفع کیا جائے خواہ اس میں کتنا ہی وقت صرف ہو اور کتنی ہی کھکیڑ اٹھانی پڑے۔

بعض نازک طبع مضمون نگار ردو بدل اور ترمیم و تنقیح کے عمل پیہم سے جان چراتے اور گھبراتے ہیں اور بعض اوقات مصنف اور مضمون نگار بننے کی خواہش انھیں عجلت اور جلدبازی پر آمادہ کرتی اور اکساتی ہے۔ اور یہ بڑے عیب کی بات ہے۔ جلدبازی سے ساری محنت خاک میں مل جاتی ہے۔ اور بسا اوقات ایسی لغزشیں رہ جاتی ہیں جو قابلِ ندامت ہوتی ہیں۔ اور جو صرف محنت اور غور و فکر ہی سے رفع ہو سکتی ہیں۔

لہذا ہر مضمون نگار کا یہ اہم فرض ہے کہ وہ کامل توجہ اور انہماک سے اس مرحلے کو انجام دے اور مضمون کے نقائص رفع کر کے اس کو جاذبیت کی جلوہ گاہ بنا دے اور اسی میں قبولیت کا راز ہے۔

اسلوبِ بیان

مضمون کا اور اسلوب بیان کا، چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلوب کی ندرت سے مضمون میں جان پڑ جاتی ہے اور مبتذل سے مبتذل مضمون بھی قابلِ تحسین ہو جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس اسلوب کی خرابی سے انوکھے سے انوکھا خیال اور مضمون ستیاناس ہو جاتا ہے۔

دراصل مضمون کا دار و مدار اسلوب ہی پر ہے۔ اسی لیے بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ عنوان کوئی اچھا برا نہیں ہوتا بلکہ مضمون نگار کا اسلوب اچھا یا برا

ہوتا ہے۔ اور یہ بجا ہے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں:۔

"قبولِ عام کا مدار زیادہ تر حسنِ بیان اور لطفِ ادا پر ہے۔ نہ کہ نفسِ مضمون پر۔ البتہ مضامین کو بھی شہرت اور قبولیت میں بہت دخل ہے"۵۱

مضمون نگار کی خوبی یہ ہے کہ اس کا اسلوب بیان مضمون کے جذبات اور کیفیات پر حاوی ہو۔ اور حسنِ ادا کی کرشمہ سازی سے مضمون کے ہر پہلو کو اور اس کی جملہ خصوصیات کو اس طرح جلوہ گر کر دے کہ وہی کیفیت پیدا ہو جائے جو اصل واقعہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔

اسلوب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ خیال کیسا ہی پیچیدہ اور دقیق ہو مگر الفاظ محاورے اور روزمرہ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اور خیالات کو سلجھا کر اس طرح ادا کیا جائے کہ سمجھنے میں زحمت اور دشواری نہ ہو۔ مہدی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:۔

"بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیے جائیں اور یہ سلاست و نفاست، قدرتِ کلام کی آخری حد ہے" ۵۲

بہرحال اسلوب کا اقتضا یہ ہے کہ مضمون جس صنفِ سخن سے متعلق ہو علمی، ادبی، تاریخی وغیرہ پیرایۂ بیان بھی اسی جیسا اختیار کیا جائے۔ مہدی مرحوم فرماتے ہیں:۔

---

۵۱ حیاتِ سعدی صفحہ ۱۲۲ ایضاً

۵۲ افاداتِ مہدی صفحہ ۲۲۲ ایضاً

"طرز...... کہیں مورخانہ ہوگا کہیں محدثانہ اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ عالمانہ اور مجتہدانہ روش ہوگی جو امور تاریخ سے متعلق ہیں ان میں وہ شہادتیں کافی ہوں گی جو عام مورخین کے نزدیک مسلم اور متفق علیہ ہیں۔ جو مسئلہ محدثانہ پہلو رکھتا ہی اس میں زیادہ تر تدقیق کرنی ہوگی۔ اور تمام پرانے اصولوں سے کام لینا ہوگا جو محدثین نے اخبار و روایات کی تنقید کے لیے قرار دیے ہیں ...." [۱]

الغرض اسلوب بیان موضوع سے متعلق اور اس کی فطرت کے مطابق ہونا چاہیے اور ایسا سلجھا ہوا اور منجھا ہوا ہونا چاہیے جس سے یہ مترشح ہو کہ یہ اسلوب ان ہی خیالات کو ادا کرنے کے لیے تخلیق ہوا ہی۔

اسلوبِ بیان جس قدر روزمرہ سے قریب تر ہوگا۔ اتنا ہی دل کش اور موضوع سے متعلق ہوگا اور اس میں بلیاختگی اور ندرت ہوگی اور پسندیدہ ہوگا اور جتنا بعید ہوگا اتنا ہی زیادہ اجنبی اور نامانوس ہوگا اور طبیعت کو اس سے وحشت ہوگی۔ اور اس کو قبولیت حاصل نہ ہوگی۔

ابتدائی اسلوب ابتدا میں ہر مضمون نگار کا اسلوب وہی ہوتا ہی۔ جو اس کی روزمرہ کی بول چال کا ہوتا ہی اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ البتہ مشق اور مطالعہ سے اس میں صفائی۔ گھلاوٹ اور بیساختگی آتی رہتی ہی۔ اور جب کبھی وہ کسی ایسے مضمون کا مطالعہ کرتا ہو

---

[۱] افاداتِ مہدی صفحہ ۲۵، ایضاً

جس کا اسلوب اس کے ذوق اور رجحان کے مناسب ہوتا ہی تو وہ اس سے بہت لذت یاب ہوتا ہی۔ اور اس رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہی۔ رفتہ رفتہ اس کوشش اور مشق سے اسلوب میں پختگی پیدا ہو جاتی ہی اور ماحولی اثرات بھی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں اور انجام کار یہی اس کا اختصاصی اسلوب قرار پاتا ہی۔

دراصل اسلوب بیان کی ساخت میں مضمون نگار کی افتادِ طبع اور اس کے فطری رجحانات کو بڑا دخل ہی۔ لہذا جیسا اس کا ذوق ہوتا ہی اسی قسم کا وہ اسلوب اختیار کرتا ہی اور اسی قسم کے موضوعات پر اسے قلم اٹھانا مرغوب ہوتا ہی۔ اور یہی مناسب بھی ہی۔ اور یہی وجہ ہی کہ شاذ و نادر ہی کوئی مضمون نگار ایسا نکلے جو ہر موضوع پر سیر حاصل لکھنے کی قدرت رکھتا ہو۔ ورنہ ہر ایک کی جولان گاہ مخصوص اور شاہ راہ جداگانہ ہی ہوتی ہی۔ اور یہی کامیابی کا پیش خیمہ ہی۔

بہرحال ابتدا میں ان ہی اسالیب کو مشعل راہ بنانا مفید ہوتا ہی جو مرغوب بھی ہوں اور عام پسند بھی۔ ورنہ کامیابی مشتبہ رہتی ہی۔

روزمرہ اور محاورہ

اہلِ زبان کے اسلوب یا روزمرہ کی بول چال کو جو حقیقی معنی میں مستعمل ہو روزمرہ کہتے ہیں۔ جیسے پانچ سات۔ دس پانچ وغیرہ نیز روزمرہ اور خلاف روزمرہ کا فرق امثلۂ ذیل سے ذہن نشین ہو سکتا ہی:-

امثلہ[۵]

خلافِ روزمرہ	روزمرہ
کلکتے سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرائے اور ایک کوس پر ایک مینار بنا ہوا تھا۔	کلکتے سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرائے اور ایک ایک کوس پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا۔
آج تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملا۔	آج تک ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔
وہ بیٹے کے مرنے سے در گور ہو گئی۔	وہ بیٹے کے مرنے سے زندہ در گور ہو گئی۔
دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا۔	دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا۔

ان امثلہ سے روزمرہ اور خلافِ روزمرہ کا فرق واضح ہے۔ روزمرہ اہلِ زبان کا خاص اسلوب ہے جسے خلافِ روزمرہ پر ترجیح حاصل ہے۔

محاورہ کہتے ہیں اہل زبان کی اس بول چال کو جو مجازی معنی میں مستعمل ہو مثلاً تین پانچ کرنا۔ ہاتوں کے توتے اڑ جانا وغیرہ۔

محاورہ ہو یا روزمرہ ان کا اطلاق ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ پر ہوتا ہے اور ان پر قیاس کر کے نئی تراکیب بھی اختراع نہیں کی جا سکتیں داغ دہلوی نے کیا خوب کہا ہے ؎

---

[۵] امثلۂ بالا مقامۂ شعر و شاعری سے ماخوذ ہیں صفحہ ۱۶۲۔

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہی داغ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہ ہو

نیز بسا اوقات گفتگو میں روزمرہ کو بھی محاورہ کہہ لیا جاتا ہی۔ لیکن اس سے مراد وہ محاورہ نہیں ہوتا۔ جس کا تعلق مجاز سے ہی بلکہ روزمرہ کی بول چال ہی مراد ہوتی ہی۔

عبارت میں روزمرہ کی پابندی حتی الامکان نہایت ضروری ہی۔ اس کے برعکس محاورے کی پابندی لازم نہیں۔ البتہ اگر محاورہ خوش اسلوبی سے ترتیب پا جائے تو یقیناً اس سے عبارت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں:۔

"نظم ہو یا نثر دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہی۔ مگر محاورے کا ایسا حال نہیں۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ پست.......کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہی۔" [۱]

الغرض کسی سنجیدہ مضمون کو سلجھا کر معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور بے تکلفی سے ادا کر دینا بڑی خوبی کی بات ہی اور ہر مضمون نگار کو اس کا لحاظ رکھنا ضروری بھی ہی۔ اور مفید بھی۔

---

[۱] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۶۴، ایضاً۔

فصاحت و بلاغت

کلام کا معائب سے پاک ہونا فصاحت ہے اور کلامِ فصیح کا اقتضائے حال کے مطابق ہونا بلاغت ہے۔

گویا کہ جو کلام صرفی و نحوی اعتبار سے درست ہے یعنی اس میں اجزائے جملہ فعل۔ فاعل۔ مبتدا۔ خبر اور متعلقات وغیرہ صحیح اور برمحل ہیں اور وہ عیوب کلام سے بھی پاک ہے یعنی اس میں تعقید۔ تنافر۔ مخالفت قیاس لغوی یا ثقیل نامانوس اور متروک الفاظ میں سے بھی کچھ نہیں تو خواہ وہ اقتضائے حال کے مطابق ہو یا نہیں وہ فصیح ہے۔ مثلاً قلم کو کہا جائے کہ یہ چھری ہے یا چاقو ہے تو چوں کہ صرفی و نحوی اعتبار سے یہ جملہ درست ہے اور معائب کلام میں سے بھی اس میں کوئی عیب نہیں۔ اس لیے یہ فصیح ہے۔ لیکن چوں کہ واقعتاً اقتضائے حال کے مطابق نہیں یعنی یہ چھری یا چاقو نہیں بلکہ قلم ہے اس لیے بلیغ نہیں۔

البتہ اگر یہی جملہ واقعہ کے مطابق ہو کہ چھری اور چاقو ہی کو یہ کہا جائے کہ یہ چھری ہے۔ یہ چاقو ہے تو چوں کہ اقتضائے حال کے مطابق ہوگا اس لیے فصیح بھی ہوگا اور بلیغ بھی۔

اسی طرح اگر استعارۃً قلم کو چھری یا چاقو کہا جائے تو درست ہوگا اور اس کو فصیح بھی سمجھا جائے گا اور بلیغ بھی۔ مگر استعارے کے لیے قرینے کا پایا جانا بھی لازم ہے۔

اگرچہ فصاحت و بلاغت کا تعلق الفاظ سے بھی ہے۔ الفاظ بھی فصیح اور

بلیغ ہوتے ہیں۔ مگر یہ فصاحت و بلاغت کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اعلیٰ درجے کی فصاحت کا تعلق ہے جملے سے اور اعلیٰ درجے کی بلاغت کا تعلق ہے اسلوب بیان۔ معانی اور مضمون سے۔

بلاغت کی خوبی یہ ہے کہ واقعہ کے اظہار میں اس کی تمام خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ دلوں پر وہی اثر ہو جو واقعہ کے پیش آنے سے ہو سکتا ہو اور اس میں دخل ہے اسلوب بیان کی کرشمہ سازی کو۔ اگر اسلوب بیان موزوں اور مناسب نہ ہو تو پھر یہ خوبی جلوہ گر نہیں ہو سکتی۔

واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی جانب منتقل ہوتے ہوئے سلسلۂ کلام کہیں منقطع نہ ہونے پائے اور کڑی سے کڑی جڑتی چلی جائے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آسان و سہل کلام کو فصیح اور ادق و مشکل کلام کو بلیغ سمجھنا نہایت غلط اور لغو ہے۔ اور اس کی کوئی اصلیت نہیں یہ جہلا کا اختراع ہے اور مہمل ہے۔

بہرحال ایک مضمون نگار کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ اپنے مضمون کو اس خوبی سے مرتب کرے کہ اس میں فصاحت کی بدلیاں جھومتی نظر آئیں بلاغت کی بجلیاں کوندتی دکھائی دیں۔ اور تاثیر کی کڑک دلوں کو ہلا دے اور فصاحت و بلاغت کے دریا امنڈ پڑیں۔ اور ناظرین پوری طرح متاثر ہو جائیں۔

استعارۂ و تشبیہہ

استعارۂ و تشبیہہ حسنِ کلام کے زیور ہیں۔ ان کے استعمال سے اسلوبِ بیان کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ کیفیات کو ابھار ابھار کر دکھانے میں مدد ملتی ہے۔ روکھے پھیکے مضمون میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے اور عبارت کا زور بڑھ جاتا ہے۔ چناں چہ امثلۂ ذیل اس کی ترجمان ہیں:-

معمولی اسلوب	مجازی تصرف
(۱) زید مر گیا	زید کا نیرِ حیات بے نور ہو گیا۔ زید موت کی آغوش میں جا سویا
(۲) چاند آسمان پر چمک رہا ہے۔	دریائے نیل میں چاند تیر رہا ہے۔
(۳) سچ ظاہر ہو گیا۔	صداقت جگمگا اٹھی۔
(۴) چاند کی شعاعیں پانی کی موجوں پر پڑ رہی ہیں۔	نورانی مچھلیاں موجِ آب میں کھیل رہی ہیں۔
(۵) فصاحت و بلاغت نمایاں ہونے لگی۔	فصاحت و بلاغت کے دریا امنڈ پڑے۔

البتہ استعارہ و تشبیہہ کے استعمال میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں۔ ورنہ مضمون چیستاں بن کر رہ جائے گا۔ اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

استعارہ و تشبیہہ کی تعریف و تفصیل علمِ بیان کی کتابوں میں مطالعہ کرنی

چاہیے۔ اس مدعا کے لیے روحِ بلاغت[1] بہت جامع اور مفید کتاب ہی۔

مطالعہ

مطالعہ مضمون نگاری کا اہم جزو ہی۔ اس کے بغیر مضمون نگاری میں کمال حاصل کرنا کارے دارد ہی۔ مطالعہ سے ذہنی قابلیت میں ترقی۔ زبان پر عبور اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہی۔ جس سے مدعا کے اظہار میں سہولت اور اسلوب میں پختگی پیدا ہوتی ہی۔

مطالعہ کے اجزا ہیں۔ اہل زبان کی صحبت۔ اہل کمال کی ہمنشینی۔ مستند اہل قلم کی تصنیفات کا مطالعہ۔ صحیفۂ کائنات کا مطالعہ اور فطرت انسانی کا مشاہدہ اور مطالعہ۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں:۔

> اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور ان کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہی کہ ان کے الفاظ و محاورات نامعلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں لیکن چوں کہ ایسا موقع ہر شخص کو ملنا دشوار ہی اس لیے ضروری ہی کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے۔ نہ اس ارادے سے کہ خیالات اور مضامین میں ان کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور خیالات کو کن اسلوب اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔" [2]

[1] روحِ بلاغت قیمت دس آنے [2] مقدمہ شعر و شاعری صـ ۱۰۵

مزید فرماتے ہیں:-

"نظم کے علاوہ اردو زبان میں جس قدر علمی تاریخی مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مستند اہلِ زبان نے کتابیں لکھی ہیں ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔" [ط۱]

اور بھی فرماتے ہیں:-

"کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہی کہ نسخہ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخہ فطرتِ انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔" [ط۲]

مطالعہ کے دوران میں جو دل آویز تراکیب۔ دل کش بندشِ الفاظ دل چسپ محاورات۔ لطیف استعارات۔ نادر تشبیہات۔ جاذبِ توجہ جملے۔ موثر اسلوبِ بیان، جہاں جہاں نظر پڑیں انھیں خاص توجہ سے پڑھنا چاہیے۔ اور اگر بہ طور یادداشت علاحدہ کسی بیاض میں انھیں لکھ لیا جائے اور فرصت کے اوقات میں انھیں زیرِ مطالعہ رکھا جائے تو بہت ہی مفید ہو سکتا ہی اس عمل سے تحریر کو اعتماد و رسوخ اور اسلوب کو تقویت حاصل ہوتی ہی اور اس سے مطالعہ کی کمی رفع ہو جاتی ہی۔

البتہ انھیں ازبر کرنا یا رٹنا مفید نہیں کیوں کہ اس عمل سے استعداد محدود اور ترقی مسدود ہو جاتی ہی۔ علامہ ابن رشیق فرماتے ہیں:-

---

[ط۱] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۰۶ [ط۲] ایضاً صفحہ ۴۳۔

بعضوں کی رائے یہ ہے کہ ایک بار اساتذہ کے کلام پر تفصیلی نظر ڈال کر اس کو صفحۂ خاطر سے محو کر دینا چاہیئے۔ کیوں کہ اس کا بعینہٖ ذہن میں محفوظ رہنا ویسی ترکیبوں اور اسلوبوں کے استعمال کرنے سے ہمیشہ مانع ہوگا۔ لیکن جب وہ کلام صفحۂ خاطر سے محو ہو جائے گا۔ تو بہ سبب اس رنگ کے جو کلام بلغا کی سیر کرنے سے طبیعت پر خود بہ خود چڑھ گیا ہے۔ اس میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ ویسی ہی ترکیبیں اور اسلوب جیسے کہ اساتذہ کے کلام میں واقع ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خود بہ خود بغیر اس تصور کے کہ یہ ترکیب فلاں ترکیب پر مبنی ہے اور یہ اسلوب فلاں اسلوب کا چربہ ہے۔ جیسی ضرورت پڑے گی بناتا چلا جائے گا۔" [1]

خواجہ حالی اس کی تائید میں فرماتے ہیں:-

"ہمارے نزدیک یہ رائے .... زیادہ وقعت کے قابل ہے اس میں اس فائدے کے سوا جو صاحب رائے نے بیان کیا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کا کلام جب تک صفحۂ خاطر سے محو نہ ہو جائے طبیعت ان ہی اسلوبوں اور پیرایوں میں مقید اور محصور رہتی ہے جو ان کے کلام کو بار بار پڑھنے اور یاد کرنے سے بمنزلۂ طبیعتِ ثانی کے ہو جاتے ہیں۔ اور جس کے سبب سے سلسلۂ بیان میں نئے اسلوب اور نئے پیرائے ابداع کرنے کا ملکہ پیدا نہیں ہوتا۔" [2]

گویا کہ مطالعۂ کتب بہت ضروری ہے۔ لیکن اسی مفاد کے پیش نظر کہ اسلوب پر قدرت حاصل ہو اور مطلب کو مختلف پیرایوں میں ادا کرنے کی

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۴۵ [2] ایضاً صفحہ ۴۵

استعداد ترقی کرے۔ اس کے برعکس ان کو رٹنا یا حفظ کرنا مراد نہیں۔

مطالعۂ کتب میں موقر رسائل و جرائد کا مطالعہ اور نامور اہلِ قلم کی تصنیفات کا مطالعہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

البتہ خود رو پیداوار اور معمولی ادبیات کے مطالعہ سے احتراز ضروری ہے کیوں کہ ان کے مطالعہ سے اسلوب بگڑ جاتا ہے۔ اور نگاہ میں عمق اور خیالات میں گہرائی پیدا نہیں ہوتی اور نفع کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔

مطالعۂ کائنات میں مناظرِ قدرت۔ مظاہرِ فطرت۔ باغ و راغ۔ سبزہ زار۔ آبِ رواں چشمۂ کوہسار اور تاریخی مقامات خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان کا غور و تامل سے مطالعہ کرنا۔ اور ان کے خواص و کیفیات سے آگاہ ہونا اور ان کی مدد سے مضمون میں آب و رنگ پیدا کرنا مضمون نگار کا فرض منصبی ہے۔

فطرتِ انسانی کا مطالعہ بہت اہم شے ہے۔ اس کے لیے بڑی رمز شناسی اور مزاج دانی درکار ہے۔ کیوں کہ انسانی طبائع مختلف رجحانات اور متضاد کیفیات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ ایک ہی شخص کو کبھی کوئی بات پسند ہے اور کبھی ناپسند۔ کبھی کسی بات سے خوش ہے۔ اور کبھی ناخوش۔ کبھی حیاتِ ابدی کا آرزومند ہے اور کبھی مرگِ ناگہاں کا متمنائی۔ حضرت اکبرؔ کیا خوب عکاسی فرماتے ہیں ؎

عجب مجموعہ ہوں میں سرکشی اور خاکساری کا
جو شعلہ باد و آتش سے تو آب و خاک سے گِل ہوں

ہجومِ آہِ سوزاں سے خیالِ روئے جاناں سے
فروغِ بزمِ ماتم ہوں چراغِ خانۂ دل ہوں
جفائے تیغِ فرقت سے خیالِ رازِ الفت سے
زبانِ حالِ بسمل ہوں سکوتِ شمعِ محفل ہوں

بہر حال ایک مضمون نگار کو فطرتِ انسانی کا مطالعہ ایک ماہرِ نفسیات کی نگاہ سے کرنا ہوتا ہے۔ اور اندازہ لگانا پڑتا ہے کہ کن کن صورتوں میں انسان کے دماغ کی کیفیات کیا ہوتی ہیں اور رجحانات کیا ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ انقلاب وحادثات کا طبائع اور رجحانات پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اور کیا کیا تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز اور گرم وسرد زمانہ سے مقتضیات اور خواہشات میں کیا تبدیلی ہوتی ہے۔ اور رجحانات کا رُخ کدھر سے کدھر پھر جاتا ہے۔ اور ماحول کے اثرات کس طرح بگاڑتے اور بناتے رہتے ہیں۔ اور انسان اپنے ماحول میں کس طرح جکڑا بندھا رہتا ہے۔ اور ماحول کی تبدیلی سے فطری افتاد کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:۔

"ماحول کا انسان کے مقصد میں بڑا دخل ہے۔ ایک ناسازگار ماحول بعض اوقات اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی صفات کو زائل کردیتا ہے۔ اگر کوئی معقول صحبت یا ماحول مل گیا اور صلاحیت بھی ہوئی تو آدمی ترقی کے اوج تک پہنچ جاتا ہے۔" [۱]

[۱] خطباتِ عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۹۷ - ۹۸ ایضاً۔

بہر کیف مضمون نگار کے لیے باقاعدہ اور مسلسل مطالعہ کی عادت نہایت اہم ہی اور وہ اس سے بیش بہا فوائد حاصل کر سکتا ہی۔ خصوصاً جب کسی عنوان پر لکھنا ہو تو پہلے اس سے متعلق کتابوں کا اور مضامین کا مطالعہ کر لینا چاہیے اور دیگر ذرائع سے بھی معلومات فراہم کر لینی مناسب ہی۔

جو مضمون نگار کسی موضوع پر پہلے سے تیار نہیں ہوتے یعنی قلم اٹھانے سے پہلے پڑھتے نہیں وہ کامیاب مضمون نگار نہیں ہو سکتے۔ ان کے خیالات و نگارشات کا زیادہ تر حصہ سطحی اور ناقابلِ توجہ ہوتا ہی اور مضمون ناقص رہتا ہی۔

لہذا مطالعہ کے باب میں پوری کوشش کرنی چاہیے اور مطالعہ کے بغیر لکھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

مقامات

ہر کام کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ مقرر ہی۔ کاروبار کے لیے منڈیاں تعلیم کے لیے مدارس۔ کھیل کود کے لیے میدان علیٰ ہذا القیاس مضمون نگاری کے لیے بھی بعض مقامات مخصوص۔ مناسب اور مفید ہیں۔

اس کے لیے زیادہ مفید جگہ گوشۂ تنہائی ہی۔ جہاں خیالات بلا مزاحمت سلسلہ وار مرتب ہو سکتے ہیں۔ خیالات کی ترتیب و تدوین کے لیے تنہائی بہت اہم اور بیحد ضروری ہی۔ کیوں کہ اگر کسی مزاحمت سے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو پھر اس کو جوڑنا بہت دشوار ہو جاتا ہی۔ محنت بھی بہت

پڑتی ہے اور وقت بھی بہت لگتا ہے۔ پھر بھی بسا اوقات وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ادنیٰ سی مزاحمت سے کوئی بات ذہن سے نکل گئی یا ترتیب بگڑ گئی تو پہروں یاد نہیں آتی اور کڑی سے کڑی نہیں ملتی۔

لہٰذا مضمون نگار کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ مضمون لکھنے کے لیے خاموشی اور تنہائی کی جگہ منتخب کرے۔ اور اس میں ذرا بھی تساہل نہ برتے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو گویا اس کا پہلا قدم صحیح اٹھا ہے اور کامیابی کی جانب اٹھا ہے۔

اسی رعایت سے باغ و راغ۔ سبزہ زار، کنارۂ دریا، چشمۂ آب، دامنِ کوہسار، جھیل و آبشار۔ قدیم کھنڈرات۔ تنہا کمرہ وغیرہ کو خصوصیت حاصل ہے۔

نیز ان مقامات میں سے اکثر کو طبیعت کی شگفتگی اور روانی۔ خیالات کی ندرت اور تازگی۔ اسلوب کی صفائی اور دل آویزی میں بھی دخل ہے۔ اور مُمِد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

بہر نوع مقدم ترین یہی ہے کہ تنہائی ہو اور خاموشی۔ اور مضمون نگار کے لیے ایسی جگہ تلاش کر لینا مفیدِ مدعا ہے۔

اوقات

مضمون نگاری کے لیے کچھ اوقات بھی ہیں اور وہ بھی اسی رعایت سے کہ سکون افزا ہوں اور کیف پرور۔ ان کے فقدان سے بھی وہی دشواری لاحق ہوتی ہے جو سکون پرور مقامات کے میسر نہ ہونے کے باعث ہوتی ہے۔

(۱) اوقات میں علی الصباح بہت موزوں وقت ہے۔ آرام پاکر تازہ دم اور طبیعت بشاش ہوتی ہے۔ سماں بھی سہانا ہوتا ہے اور ان حالات میں دماغی کام خوب ہوتا ہے۔

(۲) دوپہر کو آرام کر لینے کے بعد

(۳) رات کی تنہائی جب کائنات محوِ استراحت ہو۔

(۴) کھانا تحلیل ہو جانے کے بعد

(۵) جب طبیعت حاضر ہو اور کام کرنے کے لیے مستعد ہو۔ خیالات مرتب ہونے کے لیے آمادہ اور جذبات ابھرے پڑتے ہوں۔ اور طبیعت پر کیف سا طاری ہو۔ مگر یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ عموماً کسی موضوع پر تیاری کر لینے کے بعد۔ اس لیے کہ مطالعہ اور غور و فکر سے جو معلومات فراہم ہو جاتی ہے دماغ اسے منتقل کرنے کے لیے زور دیتا ہے اور طبیعت کو آمادہ کرتا ہے۔ یہ موقع سب سے افضل ہے اور اس وقت کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

البتہ (۱) نیند کے غلبے کے وقت (۲) بھوک کی شدت کے وقت (۳) طبیعت میں انتشار کے وقت (۴) تھکے ہوئے دماغ کی حالت میں اور (۵) کسی موضوع پر تیاری نہ ہونے کی صورت میں۔ قلم اٹھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ایسی حالت میں کچھ لکھنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اور مضمون نگاری کے نام کو بٹہ لگانا ہے۔

موسم

مضمون نگاری کے لیے معتدل موسم بہت موزوں اور کارآمد ہوتے ہیں! ان کے خصائص ہیں۔ طبیعت میں تازگی۔ خیالات میں بلندی۔ جذبات میں ابھار اور مزاج میں اعتدال۔ طبیعت راہ پاتی ہے۔ اور دشوار گزار مراحل بہ آسانی طے ہو جاتے ہیں۔

ان میں موسم سرما کا آغاز۔ موسم گرما کا آغاز۔ فصلِ بہار۔ اور برکھا رُت خصوصیت کے حامل ہیں۔ لیکن اس کا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ ان ایام کے انتظار میں کچھ کیا ہی نہ جائے۔ کام ہر موسم میں ہو سکتا ہے۔ لیکن انھیں برتری حاصل ہے۔ ان ایام میں کام زیادہ ہوتا ہے اور بہتر ہوتا ہے۔ موقع ملنے پر ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔

کام یاب مضمون نگار

کام یاب مضمون نگار وہی ہے۔ جس کو عنوان کے داخلی اور خارجی حالات و واردات کے اظہار پر کامل قدرت ہو۔ چناں چہ جب وہ کائنات کی عکاسی کرتا ہے تو اپنے وسیع مطالعہ۔ کثیر معلومات۔ اور اسلوب کی قلم کاری سے وہ طلسم کدہ بناتا اور اعجاز نمائی کرتا ہے کہ قدرت کی گل کاری اور فطرت کی نیرنگی کا بوقلموں مرقع ہو بہو نظر آنے لگتا ہے۔ اور دل چمنستانِ قدرت کے لہلہاتے گل بوٹوں کی نسیم جاں فزا سے فرحت اندوز اور سرسبز و شاداب

مرغزاروں کے نظرافروز جلووں سے منکیف ہوکر عالم کیف وسرور میں مستانہ وار پکار اٹھتا ہے ؎

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے جلوہ افگن نور ہے
تختۂ گل ہو بہو جنت نگاہِ طور ہے

اور جب وہ اپنے فطرت نگار قلم سے انسانی فطرت کی ترجمانی کرتا ہے اور داستانِ قلبی کی موشگافی کرتا ہے اور توہماتِ ذہنی کی پردہ کشائی کرتا ہے تو قلبی گہرائیوں کے عمیق اور سربمہر راز طشت از بام ہونے لگتے ہیں. قلبی تاریکیاں مجلی اور منور نظر آتی ہیں. دل کے چور ابھرنے اور نفس کی کمزوریاں جگمگاتی دکھائی دیتی ہیں. اور فطرت کے لاینحل مسائل حل ہوتے نظر پڑتے ہیں اور پڑھنے والا انہیں دیکھ کر صانعِ قدرت کی بیمثل قدرت کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے اور اپنے راز افشا ہوتے دیکھ کر پکار اٹھتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

الغرض کامیاب مضمون نگار جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے. اس پر سیر حاصل معلومات قلمبند کرتا ہے اور اسلوب کی قلم کاری سے اسے جنت نگاہ اور فردوسِ گوش بنا دیتا ہے اور یہی دلیلِ کامیابی ہے۔

مضمون نگار کا کمال

مضمون نگار کا کمال یہ ہے کہ اس کے مضمون کی عبارت ہموار اور اصول

بلاغت کے مطابق ہو۔ الفاظ و معانی میں توازن و تناسب ہو۔ اسلوب دل آویز اور مترنّم ہو۔ اور جا بجا قلم کاری کا وہ حُسن جلوہ گر ہو جو دلوں کو موہ لے۔ اور منکر سے منکر کو اعتراف کرتے ہی بن پڑے۔ اور یہ کمال مشق و مطالعہ سے حاصل ہوتا ہی۔

فطری مضمون نگار

مضمون نگاری کا ذوقِ سلیم جس کو ودیعت کیا جاتا ہی۔ دراصل وہی فطری مضمون نگار ہوتا ہی۔ اس کو اس فن سے فطری لگاؤ اور قلبی مناسبت ہوتی ہی۔ اسے اس فن کو حاصل کرنے کی چیٹک ہوتی ہی اور یہ لگن اسے آمادۂ عمل رکھتی ہی۔ اس کی طبیعت اس راہ میں مشقت سہنے سے اکتاتی اور گھبراتی نہیں بلکہ اس راہ کی مشقت میں اسے راحت ملتی ہی اور اس کے قلب کو تسکین ہوتی ہی۔ اس کا ذوق روز بروز ترقی کرتا ہی۔ اس کی طبیعت راہ پاتی ہی اور آغازِ کار ہی سے انجام کا پتہ دینے لگتی ہی۔ اسے اپنی عبارت کا عیب و صواب خود ہی نظر آنے لگتا ہی۔ اس کا ذوق اس کی راہ نمائی کرتا ہی۔ اگر بال بھر بھی کہیں کسر رہ جاتی ہی تو فوراً وہ اسے کھٹک جاتی ہی۔ اور جب تک وہ اسے رفع نہیں کر لیتا اسے کل نہیں پڑتی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں :۔

> جن لوگوں کی فطرت میں اس کا ملکہ ہوتا ہی۔ ان کی طبیعت ابتدا ہی سے راہ دینے لگتی ہی۔ اگر وہ کسی وجہ سے اس کی طرف متوجہ نہیں

ہوتے تو طبیعت کا اقتضا ان کو جبراً اس کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ وہ جب اس کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ان کو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوتی ہے اور اس لیے ان کا دل روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے۔

ان کی اپنی قوتِ ممیزہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کی برائی اور بھلائی کا اس کے بغیر کہ کسی سے مشورہ یا اصلاح لیں آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں ہر حالت اور ہر واقعہ سے .... متاثر ہونے کی قابلیت ہوتی ہے۔ اور اس قابلیت سے اگر وہ چاہیں تو بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کو خارج سے .... مصالحہ فراہم کرنے کی صرف اسی قدر ضرورت ہوتی ہے جس قدر کہ بئے کو اپنے گھونسلے کے لیے پھونس اور تنکوں کے باہر سے لانے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ سلیقہ جو الفاظ اور خیالات کی ترتیب کے لیے درکار ہے۔ وہ اپنی ذات میں اسی طرح پاتے ہیں جس طرح کہ بیا گھونسلا بنانے کا ہنر اور سلیقہ اپنی ذات میں پاتا ہے۔ وہ اساتذہ کے کلام سے صرف یہی فائدہ نہیں اٹھاتے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا یا باندھا ہے۔ اس سے مطلع ہو جائیں بلکہ ان کے ایک ایک مصرع اور ایک ایک لفظ سے بعض اوقات ان کو وہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ جو..... دکوئی دوسرا مہینوں میں کسی استاد سے حاصل نہیں کر سکتا۔" ؎۱

؎۱ مقدمہ شعر و شاعری ص ۸۸-۸۹

الغرض یہ اوصاف ہیں جو ایک فطری مضمون نگار کو ممتاز و نمایاں رکھتے ہیں اور جب وہ اپنے اس جذبے سے کام لیتا ہے اور صحیح راہِ عمل اختیار کرتا ہے تو اسے حیاتِ جاوید نصیب ہوتی ہے۔ دراصل مقصد کا عشق ہی بڑی چیز ہے اور اسی سے سب کچھ ملتا ہے۔

اہم معلومات

بعض امور مضمون نگاری سے ضمنی تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے شمول سے مضمون کی خوش نمائی اور دیدہ زیبی میں اضافہ ہو جاتا ہے لہذا وہ ترتیب وار درج ذیل ہیں:-

مقصدِ تحریر کسی تحریر کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس کو آسانی سے پڑھ لے اور سہولت سے اس کا مقصد سمجھ لے۔ اگر یہ مدعا حاصل نہ ہو تو تحریر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

لہذا جہاں مفہوم و مدعا کو سلجھا کر ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی بہت اہم ہے کہ تحریر ایسی صاف ستھری ہو کہ اس کو آسانی سے پڑھ لیا جائے اس اعتبار سے حروف و الفاظ کی ساخت اور بناوٹ صحیح اور درست ہو اور لفظ الگ الگ اور صاف صاف لکھے جائیں تاکہ مقصدِ تحریر حاصل ہو سکے۔ ورنہ اگر تحریر صاف اور شستہ نہ ہو گی تو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت ہو گی اور یہ ناکامی کی دلیل ہے۔ جس سے احتیاط لازم ہے۔

جنّاتی تحریر یا خطِ شکست بعض لکھنے والے حروف کی صحیح ساخت

سے ناواقف ہوتے ہیں اور کاہلی کی وجہ سے سیکھتے بھی نہیں۔ وہ اپنے عیب کو چھپانے کے لیے اور بھی بگاڑ کر لکھتے ہیں اور اس بے ہنری کو ہنرمندی سے تعبیر کرتے ہیں اور خطِ شکست کے دھوکے میں اس کو بھی ایک فن سمجھتے اور خطِ گھسیٹ کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ میں اسے جناتی تحریر کہتا ہوں۔

فی الواقع اس گھسیٹ کو خطِ شکست سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کو خطِ شکست سمجھنا بہت بڑا مغالطہ ہے۔ خطِ شکست ایک مستقل فن ہے[1]۔ اس کے آئین وضوابط ہیں۔ اس میں حروف کی ہئیت۔ ساخت۔ حرکات اور اس کے شوشے برجا اور بدستور رہتے ہیں۔ البتہ ظاہری شکل ممیز ہوتی ہے۔

گھسیٹ تنزل کی پیداوار ہے۔ قومی مزاج کی ناہمواری اور بدنظمی کی ترجمان ہے۔ انتشار اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اور اس سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

خوش خطی

حرفوں کی صحیح ساخت کا دوسرا نام۔۔۔ خوش خطی ہے۔ یہ نہایت شریف فن ہے۔ مضمون نگار کے لیے اس سے واقفیت ضروری ہے۔ کیوں کہ جب تحریر کسی کے سامنے آتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ حروف کی ساخت بھی صحیح نہیں۔ جو اس کی پہلی سیڑھی ہے تو اس کی طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ اور مضمون نگار کی عظمت نظروں سے گر جاتی ہے۔

لہٰذا مفرد اور مرکب دونوں حالتوں کی ساخت سے واقفیت اور ان کا استعمال مضمون نگار کے لیے بہت ضروری ہے۔ عموماً یہ غلطی ص۔ س۔ ض اور ہ کی ساخت میں واقع ہوتی ہے۔ جو تمثیلاً درج ذیل ہیں:-

[1] خطِ شکست سے واقفیت کے لیے مکتوباتِ الصمدی وغیرہ کتب کا مطالعہ مناسب ہے۔

نقشہ			
حروف	حروف کی ترکیبی شکل	صحیح ساخت	غلط ساخت
س	سد	سرب ۔ سا	سرب ۔ سا
ص	صہ	صاف ۔ صدا	صاف ۔ صدا
ض	ضد	اضافہ ۔ ضِد	اضافہ ۔ ضِد
ہ	ہہ	ذہن	ذہن

یہ غلطی غالباً اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کی ساخت میں بہ ظاہر ایک شوشے کا اضافہ ہوتا ہے۔

املا | اس حقیقت سے واقف ہونا کہ کس لفظ میں کون کون سے حروف ہیں۔ یا کوئی لفظ کن کن حروف سے مرکب ہے۔ اس فن کو املا کہتے ہیں۔

املا کا درست ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ بعض الفاظ کی املا کے التباس سے معنی میں فرق پڑ جاتا ہے۔ مثلاً فضا اور فِزا۔ ضِد اور زِد وغیرہ کہ مختلف المعنی بھی ہیں۔ تلفظ بھی مختلف ہے اور محلِ استعمال بھی جداگانہ ہے۔

اس کے علاوہ املا کی کمزوری سے یہ نقص بھی وارد ہوتا ہے کہ جب دیکھنے والا یہ دیکھتا ہے کہ املا بھی درست نہیں۔ جو پہلا قدم ہے تو آگے کیا ہوگا۔ وہ پہلے ہی بددل ہو جاتا ہے۔ اور اس سے مضمون کی عظمت کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ جو کامیابی کے لیے سدِّ راہ ہے۔ لہٰذا املا کی صحت اور درستی میں پوری توجہ صرف کرنی چاہیے۔

صفحے اور سطر کی تکمیل

صفحے اور سطر کو ہمیشہ پورے لفظ پر ختم کرنا چاہیے۔ لفظ کے کسی جزو پر ختم کرنے سے مفہوم کے سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ مشق سے یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ سطر کس لفظ پر ختم ہوگی لہذا اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ آخری لفظ خصوصاً اسم اور فعل کے ٹکڑے نہ ہونے پائیں۔ یہ نہیں کہ ایک ٹکڑا ایک سطر میں ہو اور دوسرا دوسری سطر میں مثلاً ایک سطر کے آخر میں گھو اور دوسری سطر کے شروع میں ڑا۔ اسی طرح آ ایک سطر میں اور جائے دوسری میں یہ تحریر کا بڑا نقص ہے۔ اس سے پرہیز چاہیے۔ اور صفحے کے اختتام پر بھی اس کا اہتمام رکھنا چاہیے۔

رسمِ خط

ترقی کرنے والی ہر زبان میں نشو و نما پانے اور اصلاح و تغیر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور یہ اس کی زندگی کی دلیل ہے۔ اردو زبان زندہ زبان ہے۔ اس کے اسالیب اور رسمِ خط میں ماحول کے اعتبار سے ہمیشہ تغیر ہوتا رہا ہے۔ اور اہلِ کمال ہمیشہ ترقی یافتہ طرزِ نگارش کو اختیار کرتے رہے ہیں۔ جس کے شاہد زبان کی تاریخ اور قدیم مخطوطات ہیں۔

لہذا ترقی یافتہ رسمِ خط کو اختیار کرنے اور بروئے کار لانے سے مضمون کی خوش نمائی میں اضافہ ہوتا ہے اور مضمون کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ چناں چہ عام رسمِ خط اور ترقی یافتہ رسمِ خط کی امثلہ تشریح کے ساتھ

درج ذیل ہیں :۔

شمار	تشریح	ترقی یافتہ رسم خط	عام رسم خط
۱	جو لفظ مستقل حیثیت رکھتے ہوں انہیں الگ الگ لکھا جائے۔ ملا کر نہ لکھا جائے	اس کو۔ اس کے مجھ کو۔ اس نے	اسکو۔ اسکے مجھکو۔ اسنے
۲	یائے مجہول جب ساکن ہو اور اس سے پہلے حرف پر زبر (فتحہ) ہو۔ تو اسے یائے معروف کی طرح لکھا جائے۔ مگر دائرہ نصف رہے۔	ہر۔ شر قی۔	ہے۔ سے قے۔
۳	یائے مجہول جب زیر (کسرہ) والی ہو اور اس سے پہلے حرف کی حرکت زیر (کسرہ) ہو تو یائے مجہول لمبی (ے) لکھی جائے اور اس کے نیچے دو نقطے لگائے جائیں	کیے۔ دیے	کئے۔ دئے
۴	یائے مجہول جب زیر (کسرہ) والی ہو اور اس سے پہلے حرف کی حرکت زبر (فتحہ) ہو تو یائے مجہول لمبی (ے) لکھی جائے اور اس پر ہمزہ (ء) لگایا جائے! اور ایسا ہی مروج ہے	گئے۔ آئے	۔ ۔

۵	ہائے مختفی (ہ) جب دو حرفوں کے درمیان یا آخر میں آتی ہے تو اس کی حرکت نمایاں رہتی ہے۔ (البتہ جب کہ حرفِ بیان ہو تو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں۔)	کہہ ۔ کہنا سہنا	کہ ۔ کہنا سہنا
۶	جب شین اور سین یا دو شین یا دو سین مرکب ہوں تو پہلے کو کشش سے اور دوسرے کو شوشہ دار لکھا جائے	کوشش نشست کشش سست	کوشش نشست نشست کشش کشش سست سست
۷	جو لفظ جس طرح بولا جائے اسی طرح لکھا جائے۔	ترقی کا ذریعہ کیا ہے وہ کس ذریعے سے پہنچا۔ اضافے کی ضرورت اضافہ کیا گیا	" " " وہ کس ذریعہ سے پہنچا اضافہ کی ضرورت " " "
۸	مخلوط ہ کو دو چشمی (ھ) لکھا جائے۔ اور دو چشمی سے لکھے جانے والے حروف یہ ہیں: بھ ۔ پھ ۔ کھ ۔ جھ ۔ چھ ۔ دھ ۔ ڈھ رھ ۔ ڑھ ۔ کھ ۔ گھ ۔ لھ ۔ مھ ۔ نھ	گھر ۔ پھر مجھ ۔ لکھ کھا ۔ تمھیں تمھارا ۔ انھیں	گہر ۔ پہر مجہہ ۔ لکھہ کہا ۔ تمہیں تمہارا ۔ انہیں

۹	جب یائے معروف کسی لفظ کے آخر میں ہو اور الگ ہو تو اس پر ہمزہ لگانے کی صورت میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔	ہوئی۔ آئی	ہوئی ۔ آئی
۱۰	فارسی نسل کے حروف میں ہمزہ استعمال نہ کیا جائے۔	آیندہ	آئندہ

علاماتِ نگارش

عبارت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے کچھ علامات اور نشانیاں ہیں۔ ان کے استعمال سے خوش اسلوبی نمایاں ہوتی ہے۔ نظر کو سکون ملتا ہے۔ ذہن جملے کی ساخت یا جزو جملہ کی صحیح ساخت کو شناخت کر لیتا ہے۔ اور مطلب کی فہمید میں سہولت ہوتی ہے۔

نقشہ علاماتِ نگارش

شمارہ	نام	تشریح	شکل
۱	فجائیہ	ندا۔ تعجب۔ حسرت۔ دعا۔ قسم۔ اور خوشی و انبساط کے اظہار کے لیے۔	! !!

۲	سکتہ	اسما اور ضمائر وغیرہ کے درمیان جب ہلکا سا وقفہ مقصود ہو۔ مثلاً کلو، موہن اور رشید آئے۔	،
۳	وقفہ	جب سکتے سے زیادہ ٹھیراؤ مقصود ہو۔ مثلاً جو کرے گا؛ سو بھرے گا۔	؛ یا ۔
۴	ختمیہ	جملے یا پیراگراف کے خاتمے پر جب زیادہ ٹھیراؤ مقصود ہو۔	—
۵	تفصیلیہ	کسی طویل اقتباس یا کسی فہرست کو پیش کرنے کے لیے۔	:-
۶	واوین	جب کوئی عبارت بہ طور اقتباس اپنے مدعا کی تائید میں نقل کی جائے تو اس کے اول و آخر چھوٹے چھوٹے دو، دو واؤ بنا دیے جائیں۔ پہلے سیدھے اور دوسرے الٹے اور دائیں بائیں جگہ بھی چھوڑ دی جائے۔	" "
۷	واوین مضاعف	جب اقتباس در اقتباس ہو تو اندرونی اقتباس	

		پر ایک ایک اور بیرونی پر دو، دو واؤ بنائے جائیں۔	" ' ' "
۸	استفہامیہ	سوالیہ جملے کے اظہار کے لیے جملے کے آخر میں یہ علامت لگائی جاتی ہے۔	؟
۹	قوسین	یہ علامت جملۂ معترضہ کے شروع اور آخر میں لگائی جاتی ہے۔ مثلاً میرا گھر (مکان کا وہ حصہ جس میں میری سکونت ہے) بوسیدہ ہو گیا ہے۔ قوسین کے استعمال میں یہ ضروری ہے کہ اگر قوسین کے درمیان کی عبارت حذف کر دی جائے تو اصل عبارت کا ربط قائم رہے۔	( ) [ ] { }
۱۰	صفحہ	جب صفحے کا نمبر شمار بتانا منظور ہو تو یہ علامت بنا کر اس پر صفحے کا نمبر شمار لکھ دیا جائے۔ مثلاً صفحہ ۴ لکھنا ہے۔ تو اس کو اس طرح لکھا جائے صـــ۴	صـــ
۱۱	شعر	شعر لکھنا ہو تو عبارت کے بعد یہ علامت لکھی جاتی ہے۔ اور دوسری سطر میں شعر لکھتے ہیں۔	؎

۱۲	مصرع	مصرع لکھنا ہو تو عبارت کے بعد یہ علامت لکھی جاتی ہے اور دوسری سطر میں مصرع لکھتے ہیں۔	ع

صفائی

مضمون نگار کی طبیعت کی نفاست اور دیگر اشیا کی صفائی بھی مضمون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر مضمون نگار کی طبیعت پاکیزہ۔ جذبات و خیالات پاکیز لباس، نشست گاہ اور دیگر ضروریات قلم۔ دوات۔ کاغذ اور روشنائی غرض کہ ہر شے میں صفائی اور ستھرائی کا اہتمام ہے تو ضرور اس کے مضمون میں صفائی کے اثرات ہوں گے۔ اور وہ بیک نظر ناظرین کو اپنی جانب متوجہ کر لے گا۔

اور اگر قلم دوات خراب اور گندی ہے روشنائی غلیظ ہے۔ کاغذ پر داغ دھبے ہیں۔ خراب اور میلا ہے۔ کاٹ چھانٹ کی کثرت ہے۔ اور طبعی سلیقہ شعاری کے اثرات مفقود ہیں۔ تو پڑھنے والے کی طبیعت کو وحشت ہو گی۔ اور وہ اس کے پڑھنے سے گھبرائے گا۔ اور یہ ناکامی کی دلیل ہے۔

لہٰذا جہاں تک ممکن ہو ہر شے میں صفائی اور ستھرائی کا پورا پورا اہتمام رکھنا چاہیے کیوں کہ صفائی کی کشش کامیابی کی ضامن ہے۔

امتحانی مضامین کی جانچ پڑتال

ممتحن کیا چاہتا ہے؟ امتحانی مضامین میں ممتحن کیا چاہتا ہے۔ اور کیا چیزیں جانچی جاتی ہیں؟ چوں کہ یہ معلومات

طلبہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہے۔ لہٰذا سلسلہ وار درج ذیل ہے:-

(۱) مضمون مقررہ وقت کے اندر لکھا جائے اور مکمل ہو۔

(۲) خط صاف ستھرا ہو۔ جو آسانی سے پڑھ لیا جائے۔

(۳) صرف ونحو۔ املا۔ محاورے اور روزمرہ کی غلطیاں نہ ہوں۔

(۴) خیالات ستھرے اور پاکیزہ ہوں۔

(۵) ترتیب صحیح اور درست ہو۔

(۶) بہ کثرت کاٹ چھانٹ اور داغ دھبے نہ ہوں۔

(۷) اسلوبِ بیان موزوں اور دل نشین ہو۔

(۸) الفاظ بوجھل اور ثقیل نہ ہوں۔

(۹) جملے مختصر ہوں۔ طویل نہ ہوں۔

(۱۰) مضمون پیراگراف میں تقسیم ہو۔

(۱۱) ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہوں۔

(۱۲) حاشیہ مناسب ہو اور پیراگراف کی ابتدا میں مقررہ جگہ چھوڑی گئی ہو۔

(۱۳) ضخامت حسب ہدایت ہو۔

بعض ممتحن مضمون کے لیے الفاظ یا سطروں کی تعداد مقرر کر دیتے ہیں۔ سطروں کا اندازہ تو مشکل نہیں لیکن الفاظ شماری وقت طلب ہے۔ اس کے لیے سہل تدبیر یہ ہے کہ پانچ سطروں کے الفاظ گن کر ان سے اندازہ کر لیا جائے کہ مقررہ الفاظ کتنی سطروں میں ہو سکتے ہیں اور اتنی ہی سطروں کا مضمون لکھ دیا جائے۔ یہی کافی ہے۔

(۱۴) ممتحن کی خوشامد اور بیہودہ نقش ونگار نہ ہوں۔
(اس سے ممتحن پر الٹا اثر پڑتا ہے۔)
(۱۵) مضمون میں کوئی ایسی خامی نہ رہے جو نظرِ ثانی سے رفع ہوسکتی ہو۔ امتحانی مضمون عجلت میں لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے کچھ لفظ لکھنے سے رہ جاتے ہیں۔ لہذا آخر میں دس پانچ منٹ نظرِ ثانی میں صرف کر دینے چاہئیں۔

امتحانی ہدایات

امتحانی مضامین کے لیے بھی پہلے چند منٹ غور کر لینا چاہیے۔ اور اشارات نوٹ کر لینی چاہئیں۔ اگر یہ اشارات امتحانی کاپی کے کسی صفحے پر لکھ لیے جائیں تو بھی مضائقہ نہیں البتہ بلاٹنگ پیپر یا کسی علاحدہ کاغذ پر لکھنا مناسب نہیں۔

اگر ورق دو ورق بھی صرف ہو جائیں۔ اور ان پر ابتدائی مسودہ تیار کر لیا جائے تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ البتہ اگلے صفحات پر نقل کر لینے کے بعد انھیں موڑ دینا چاہیے۔ میں ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن انھیں پھاڑ کر پھینکنا امتحان کے آئین کے خلاف ہے۔

اگر کسی صفحے پر زیادہ کاٹ چھانٹ یا زیادہ داغ دھبے ہوں تو اس کی عبارت اگلے صفحے پر نقل کر کے اسے بھی موڑ دینا چاہیے۔

غرض کہ کوئی ایسی چیز نہ رہے تو ممتحن کے لیے ناگوارِ خاطر ہو۔ پھر کامیابی ہی کامیابی ہے۔

تکملہ

(گُر کی بات)

آخر میں یہ بتا دینا بھی مناسبِ محل ہی کہ مضمون نگاری کے لیے مقدم ترین شئے؛ مشق ہی۔ لکھنا اور لکھتے رہنا یہی بڑا گُر ہی۔

مشق سے ذوق اجاگر ہوتا ہی۔ اسلوب میں پختگی آتی ہی۔ مطالعہ کی ضرورت داعی ہوتی ہی۔ اور اصول پر عمل کرنے کی عادت پڑتی ہی اور وہ سب مل جاتا ہی جو درکار ہوتا ہی۔ یہ بڑے تجربے کی بات ہی اور بڑے گُر کی بات ہی۔

ع کر دیکھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہی

فنِ خطّاطی میں کمال حاصل کرنے کے لیے کسی تجربہ کار استاد کا مشورہ ہی اور بڑا معقول مشورہ ہی۔ وہ فرماتے ہیں ؎

گر ہمی خواہی کہ باشی خوش نویس
می نویس و می نویس و می نویس

اگر خوش نویس بننے کی تمنا ہی تو لکھتے رہو لکھتے رہو لکھتے رہو۔ خوش نویس بن ہی جاؤ گے۔

میرا بھی یہی مشورہ ہی۔ میں بھی یہی کہتا ہوں اور نہایت وثوق سے کہتا ہوں لکھتے رہو۔ لکھتے رہو۔ لکھتے رہو۔ باکمال مضمون نگار بن ہی جاؤ گے۔ یہ بڑے گُر کی بات ہی۔ بڑے تجربے کی بات ہی اور بہت ہی بکار آمد ہی ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند   جوانانِ سعادت مند۔ پندِ پیرِ دانا را

تمثیلی مضامین

طالبِ علم کے فرائضِ منصبی

ایک حکیم کا قول ہے:-

"بچپن میں اپنے کو کام کرنے کے لائق بناؤ۔ جوانی میں کام کرو۔ تاکہ بڑھاپے میں آرام پاؤ۔"

بچپن نشو و نما کا زمانہ ہے۔ یہی وقت ہے کہ جیسا چاہے آدمی اپنے کو بنالے۔ کچی ٹہنی کی طرح جدھر چاہو موڑ لو۔ اس عمر میں دل توانا اور دماغ تر و تازہ اور تربیت کے لائق ہوتا ہے۔ یہ بالی عمر اور فراغت کا زمانہ پھر نصیب نہیں ہوتا۔

چناں چہ جن خوش نصیب لوگوں نے اس گراں بہا وقت کی قدر کی اور کارآمد بنایا۔ وہی دنیا میں آفتاب بن کر چمکے۔ اور ان کے نام کو حیاتِ جاوید نصیب ہوئی۔ حالیؔ، اقبالؔ، اکبرؔ اور سعدیؔ ان ہی خوش نصیب ہستیوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنے لمحاتِ فرصت کی منزلت کو سمجھا اور کام میں صرف کیا۔

لہذا یہ ہر طالب علم کا فرضِ منصبی ہے کہ اپنے وقت کی قدر جانے اور کام کو باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ انجام دے: تاکہ حیاتِ مستعار کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے پائے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:-

"وقت از دست رفتہ و تیر از کمان جستہ باز نیاید"

گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے پیشِ نظر علی الصباح سو کر اٹھنا چاہیے۔ اور ضروریات زندگی سے جلد فراغت حاصل کر کے مشاغل علمی میں منہمک ہو جانا چاہیئے۔

صبح کے وقت طبیعت آسودہ اور دل و دماغ تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس لیے جو کام اس وقت انجام پذیر ہو جاتے ہیں اور جس خوبی سے سرانجام ہو جاتے ہیں وہ اور کسی وقت نہیں ہوتے۔

حکما کی یہ بھی رائے ہے کہ علی الصباح اٹھنا۔ انسان کو تن درستی۔ مال داری اور عقل مندی کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ پھر کون ہے جو اس نعمت سے مالا مال نہیں ہونا چاہتا۔

طالب علم کا فرض ہے کہ وہ علم کو علم سمجھ کر حاصل کرے اور اس کے اصل مقصد اور حقیقی فوائد کو پیشِ نظر رکھے اور اس کی اہمیت کو نظر انداز نہ ہونے دے۔

علم کیا ہے؟ زندگی ہے۔ زندگی کی روشنی ہے۔ کلیدِ کام یابی ہے۔ اور زندگی کی مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کے برعکس جہالت تاریکی ہے اندھیرا ہے۔ ناکامی ہے اور ذلت ہے۔

علم کے بغیر زندگی کا کوئی کام بخیر و خوبی سرانجام نہیں ہوتا۔ علم سے کائنات کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ اور بگڑے کام بنائے جا سکتے ہیں۔ علم سے دلوں پر حکومت کی جا سکتی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسی کی بدولت ہو رہا ہے۔ در اصل سارے عالم میں اسی کی حکم رانی ہے۔

علم افلاس کو دور کرتا ہی۔ اور ذلّت کو عزت سے بدل دیتا ہی۔ ایک حکیم نے کیا سچ کہا ہی:۔

"علم افلاس میں مال ہی اور مال داری میں زیور ہی"

لہذا طالب علم کو چاہیئے کہ وہ طلبِ علم میں کوتاہی نہ کرے اور تن دہی سے اس نعمت کو حاصل کرے۔ اور مستقل مزاجی سے مسلسل اور لگاتار کوشش کرتا رہے۔ اس کی برکت سے کبھی ناکام نہ ہوگا۔ اگر اتفاق سے کبھی ناکامی کا منحوس چہرہ نظر آ بھی گیا تو گھبرانا ہرگز نہ چاہیے بلکہ کوشش کو اور بھی تیز تر کر دینا چاہیے۔

ناکامی اور کام یابی توام ہیں۔ یہ زندگی کا لوازمہ ہیں۔ ناکامی سے ہمت کے بازو مضبوط ہوتے ہیں اور کوتاہیاں رفع کرنے کی جرات پیدا ہوتی ہی۔ اور لگاتار کوشش اس کا سب سے بڑا علاج ہی۔

کانگریس کی کام یابی۔ محمود غزنوی کی فتح یابی اور ہمایوں کی بازگشت اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اور تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ جو صفحاتِ عالم پر ہمیشہ سنہری حروف میں لکھے رہیں گے۔

بہرحال طالب علم کی کام یابی کا راز اسی میں ہی۔ کہ اپنے تعلیمی مشاغل کو پوری دل چسپی اور انہماک سے انجام دے اور لگاتار کوشش کرتا رہے اور بددلی اور بے توجہی سے پرہیز کرے۔

مطالعہ مقاصدِ تعلیم کا علم بردار ہی۔ طالب علم کو تمام و کمال

مطالعہ | گھر سے مطالعہ کر کے لے جانا چاہیے۔ مطالعہ کا طریقہ یہ ہی

کہ پہلے اس حصۂ کتاب کو پڑھے جس کو دوسرے دن مدرسے میں پڑھنا ہی۔ اور پڑھنے کے دوران میں ان الفاظ ومحاورات پر نشان لگالے جن کے معنی معلوم نہ ہوں اور انھیں کاپی پر لکھ لے۔ بعدازاں لغت سے ان کے معنی تلاش کرکے لکھے اور دو چار بار ان پر نظر ڈال لے۔ پھر اس سبق کو ان کی مدد سے از سر نو پڑھنے سے ابتدائی مفہوم واضح ہوجائے گا۔ اور یہی کافی ہی۔

اگلے دن جب استاد اس سبق کو پڑھائے اور توضیح وتشریح بیان کرے تو مفہوم کی گہرائی اور مصنف کی غرض وغایت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور چوں کہ ابتدائی مراحل مطالعہ کے دوران میں طے ہوچکے ہیں۔ اس لیے دقیق نکات اور مشکل مطالب بہ آسانی ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔ اور مزید ضرورت باقی نہیں رہتی اگر گھر پر آکر ایک بار اور اس سبق کو دہرا لیا جائے تو وہ سطح دماغ پر ایسا نقش ہوجاتا ہی کہ بھولائے نہیں بھولتا اور مٹائے نہیں مٹتا اور اس طرح مطالعہ کرنے اور پڑھنے سے طالب علم میں خداداد ذہانت اور بے مثل لیاقت پیدا ہوتی جاتی ہی، جو اسے عزت بھی بخشتی ہی اور زندگی کی دشوار گزار گھاٹیوں میں خضر راہ بھی ہوتی ہی۔

اس کے برعکس جو طالب علم استاد کے پڑھانے سے پہلے مطالعہ نہیں کرتے اور استاد کے سامنے کورے ہی جا بیٹھتے ہیں۔ تو چوں کہ انھیں ابتدائی مطالب پر عبور نہیں ہوتا اس لیے نہ تو وہ ابتدائی مطالب ہی کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اور نہ انتہائی کو۔ بلکہ بیک وقت بوجھ کے

پڑ جانے سے ان کی طبیعت اس کو برداشت نہیں کرتی اور وہ گھبرا اٹھتے ہیں۔ اور دماغی الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انجام کار جیسے گئے تھے ویسے ہی اُٹھ آتے ہیں۔ بلکہ بددلی اور بڑھ جاتی ہی۔ اور وقت ضائع جاتا ہی۔ یہ کام یابی کے لچھن نہیں۔

چناں چہ جو طالب علم ناکام رہتے ہیں۔ ان میں اکثریت ایسے ہی طالب علموں کی ہوتی ہی جو مطالعہ کے عادی نہیں ہوتے اور یہ بدشوقی ناکامی کی دلیل ہی۔ لہٰذا طالب علم کا یہ فرضِ منصبی ہی کہ وہ شوق سے علم حاصل کرے اور پوری توجہ سے اس منزل کو عبور کرے۔ یہی زندگی میں کام یابی کا پیش خیمہ ہی۔

مقصدِ تعلیم

تعلیم کا مقصد کیا ہی؟ دولت کمانا۔ دولت کے ڈھیر لگانا۔ امتحان میں کام یابی حاصل کر لینا۔ یا اور کچھ۔ در اصل ان میں سے ایک بھی مقصدِ تعلیم نہیں یہ وہ چیزیں ہیں جو تعلیم سے خود بہ خود حاصل ہو جاتی ہیں۔ انھیں غلطی سے مقصدِ تعلیم سمجھ لیا گیا ہی جو خیال کی پستی کی دلیل ہی۔ تعلیم کا مقصد ان سے بہت بلند اور بہت اعلیٰ ہی۔ ان کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

تعلیم کا مقصد ہی۔ اخلاقِ فاضلہ کا اکتساب یعنی کام یاب زندگی کے لیے جن اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ کی ضرورت ہی اور عادت و اطوار اور کردار کی پختگی درکار ہی۔ ان سب سے آگاہ ہونا۔ انھیں سیکھنا اور ان پر عمل کرنا بلکہ انھیں طبیعتِ ثانیہ بنا لینا یہ ہی مقصدِ تعلیم تاکہ

زندگی کی شاہ راہ میں جو نت نئے حالات پیش آئیں ان کے مقابلے کے لیے کمربستہ ہوں اور ہر وقت بغلیں نہ جھانکنی پڑیں اور نئے سے نئے اور اہم سے اہم کام کو اس خوبی سے انجام دے لیا جائے کہ جیسے کوئی واقف کار یا ماہر فن انجام دے لیتا ہے۔ اور ناواقفیت کی بنا پر مشکلات سے دوچار نہ ہونا پڑے اور نہ وقت ضائع کرنا پڑے۔

اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ برائی بھلائی کا امتیاز ذہن نشین رہے تاکہ برائیوں سے پرہیز کیا جاسکے اور ان کی مضرت سے محفوظ رہ سکیں۔

اگر تعلیم سے یہ مدعا حاصل ہو گیا۔ یعنی کردار مضبوط اور اخلاقِ فاضلہ کا ملکہ راسخ ہو گیا اور برائیوں سے بچنے کی عادت پڑ گئی تو پھر کس بات کی کمی رہی۔ اور پھر کوئی وجہ نہیں جو زندگی ناکامی سے بسر ہو اور شادکامی نصیب نہ ہو۔ اور انسان دنیا و مافیہا کی دولت سے مالامال نہ ہو جائے۔ بلکہ عاقبت میں بھی اس کا بڑا حصہ ہوگا۔

کتابوں کے ورق گردانی کر لینا یا حروف کا تال میل سیکھ لینا یا رائج الوقت سکولوں کو بٹورنے کے لائق بن جانا یا سندوں کا جمع کر لینا یہ کوئی تعلیم نہیں اور نہ اس سے کچھ حاصل۔ یہ نادانی ہے اور تضیع اوقات۔ علم کی روشنی حاصل کرنا اور اس کے فوائد سے لطف اندوز ہونا یہ ہے تعلیم اور یہی ہے مقصدِ تعلیم۔ علم و عمل۔ ایک گاڑی کے دو پہیے اور لازم و ملزوم ہیں۔ انھیں الگ الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ توازن قائم

رکھتا ہے۔

بہر حال یہ چند باتیں ہیں جو طالب علم کے لیے فرائضِ منصبی کا مرتبہ رکھتی ہیں اور زندگی کے لیے خضرِ راہ ہیں۔ اگر علم سے اور زندگی سے لطف اندوز ہونا ہے تو دورانِ تعلیم میں ان پر عمل کرنا چاہیے۔

برکھا رُت

برسات ہندوستان کا موسمِ بہار ہے۔ اسی کا پیارا نام "برکھا رُت" ہے اس موسم کے آتے ہی ہر شے میں تازگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ دل کی امنگیں ابھرنے لگتی ہیں۔ پھول پھلواری پیڑ پودے سب ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ اودی اودی گھٹائیں گھن گھور چھا رہی ہیں، بادل امنڈ امنڈ کے آرہے ہیں۔ دھنواں دھار مینھ برس رہا ہے۔ ابھی یہ کچھ تھا ابھی مطلع صاف۔ لطیف ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے دل موہے لیتے ہیں۔ ہر شے پر رُوپ ہر چیز دُھلی دھلائی صاف شفّاف دل میں کھبی جاتی ہے۔

حوض اور تالاب بھر کے کٹورہ ہو گئے ہیں۔ سبزے کی لہلہاہٹ پانی کی لہریں، من موہے لیتی ہیں۔ دل کی امنگیں بھر بھرانے لگتی ہیں۔ پرندے اس شاخ سے اس شاخ پر پھدکتے اور پھُر پھُر کرتے پھرتے ہیں ۔

پھرتی ہیں کرتی ہُر پُھر چڑیاں   اڑتی ہیں پُھر پُھر۔ پُھر پُھر چڑیاں

پڑتی ہیں بوندیں جھلمل جھلمل   ہنستی ہیں کلیاں کھِل کھِل کھِل کھِل

بلبل چہچہا رہے ہیں۔ کوئل کوک رہی ہے۔ پپیہے پیہو، پیہو کر رہے ہیں۔ عجب بہار ہے اور عجب لطف ہے ؎

کرتے ہیں پپیہے پیہو، پیہو
اور مور جھنگارتے ہیں ہر سو

برسات کیا آئی، جان میں جان آگئی۔ باغوں میں کھمّ گڑھے ہیں، جھولے پڑے ہیں۔ لڑکی بالیوں کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہے۔ سُرخ سُرخ جوڑے اور دھانی چوڑیاں پہنے کچھ جھول رہی ہیں، کچھ جھلا رہی ہیں۔ ملار گائے جا رہے ہیں۔ ساون کے گیت ہو رہے ہیں۔

---

(۱)

جھولا کن ڈارو رے امریاں   جھولا کن ڈارو رے امریاں
رین اندھیری تال کنارے۔ مرلا جھنکارے۔ بادل کارے بوندیں پڑیں بھنیاں بھنیاں
جھولا کن ڈارو رے امریاں
دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھلائیں   چار مل گیاں بھول بھلیاں
جھولا کن ڈارو رے امریاں

(۲)

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن تیرے ساتھ
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا بجائے بین بانسری۔ جوگیا بجائے بین بانسری۔ جوگن گائے آج ملار
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہی بدیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے۔ جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

(۳)

جو پیا آون کہہ گئے اجھوں نہ آئے سوامی ہو ای ہو جو پیا آون کہہ گئے
آون کہہ گئے آئے نہ بارہ ماس ای ہو جو پیا آون کہہ گئے
(خسرو)

کہیں بچے بچیاں گیت گا رہے ہیں:-

اماں آڑو جامن گھلے دھرے اماں میں نہیں کھاتی میری ماں
اماں تتنا پانی بھرا دھرا اماں میں نہیں نہاتی میری ماں
اماں دھانی جوڑا سلا دھرا اماں میں نہیں پہنتی میری ماں
اماں بھائی بھاوج ملن کھڑے اماں میں نہیں ملتی میری ماں
اماں ساجن ڈولا لیے کھڑا اماں میں نہیں جاتی میری ماں

(۴)

اماں میرے ابا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا با دا تو بڈھا ری — کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری — کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری — کہ ساون آیا

برسات کیا آئی۔ پیام زندگی لائی۔ جو بھی ہے اپنی دھن میں مست ہے۔ کہیں تانیں اڑ رہی ہیں۔ کہیں کوئی کسی شعر کو گن گنا رہا ہے۔

آئی بدریا برسن کو — ترست ہے دل درسن کو
آئی بدریا برسن کو

جمگھٹ کے جمگھٹ اِدھر سے اُدھر آجا رہے ہیں۔ تیراکی کا میلا بھرا ہے۔ کوئی کیسے تیر رہا ہے اور کوئی کیسے!! پھوار پڑ رہی ہے۔ حوضوں میں آم پڑے ہیں۔ کہیں آم کھائے جا رہے ہیں۔ گٹھلیاں چل رہی ہیں۔ نوردز سنائے جا رہے ہیں۔ سیریں جا رہی ہیں۔ پکوان کی بہار ہے۔ کڑھائیاں چڑھی ہیں۔ اندرسے کی گولیاں تلی جا رہی ہیں۔ سہال بنائے جا رہی ہیں۔ شام ہوئی میلا اکھڑنا شروع ہوا۔ ذرا کی ذرا میں۔ سُن سان ہُو کا میدان ہوگیا۔ اب وہ جنگل میں منگل کہاں؟ ساری رونق آدم کے دم سے ہے۔ جب آدم

نہیں تو ردنق کہاں اور بہار کیسی؟

اصل میں یہ سارے چونچلے ہیں۔ دولت اور فراغت کے۔ وہ خوش نصیب قومیں جو جان جوکھوں میں ڈال کے بے جگری سے مشکلات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اپنی حیثیت کو قائم رکھنے کے لیے دن رات دکھ بھرتی، اور مشقت سہتی ہیں۔ ایسی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا ان ہی کا حصّہ ہے۔

بدنصیب ہیں وہ قومیں جو ذلت میں دن بسر کریں۔ اور مصیبت میں رات کاٹیں۔ برسات ان کے لیے خوشی کا پیام نہیں مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔ مینھ نہیں برستا ہے۔ آٹھ آٹھ آنسو برسات ان کے حال پر روتی اور خون کے دریا بہاتی ہے۔

برسات کا مزہ ہے صحت بخش مکانوں کے رہنے والوں کے لیے کشادہ کمرے۔ وسیع صحن۔ پائیں باغ۔ ہوادار دالان۔ صاف ستھری سڑکیں جہاں یہ نہ ہو۔ تاریک حجرے۔ تنگ صحن۔ کچی گلیاں۔ ذلّت کی مشقت اور مصیبت کی زندگی ان کے لیے کیسی بہار اور کیسی برسات!! لیکن کیا ان کے دن پھریں گے نہیں؟ پھر تو سکتے ہیں مگر پیکرِ عمل بننے کے بعد۔

ع عمل سے زندگی جنت بھی ہے جہنم بھی!

احساسِ ذلت بھی ہو اور توفیقِ عمل بھی تو پھر کایا پلٹ جاتی ہے۔ ع

وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا

ہاں ایک ذلیل ذہنیت اور کاہل زندگی کی۔ یہی درگت ہوتی ہے۔ کیا صحیح نقشہ ہے۔

اللہ پاک نے ایک بڑے درجے کی غلام ذہنیت انسان کی مثال بیان فرمائی ہے۔ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کی ساری چیزوں پر اوروں کا قبضہ ہوتا اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہتا۔ سب کچھ آقا ہی کرتا دھرتا ہے اور اس کو یہ وبال معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس پر بوجھ بنا پڑا ہے۔ یہ کم بختی کا مارا جدھر رُخ کرتا ہے۔ بھٹکارہی کھاتا ہے اور کہیں سے اس کو بھلائی نہیں ملتی۔

اگر دنیا میں رہنا ہے اور زندوں کی طرح رہنا ہے تو عمل کے لیے مر مٹو! اسی کا نام زندگی ہے اور اسی میں لطفِ زندگی ہے ؏

"زندگی کے واسطے حسنِ عمل درکار ہے"

وہی قومیں دنیا میں زندہ رہتی ہیں جو مشکلات کا مقابلہ کرتی اور مرتی کھپتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اور کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھتیں۔ وہ پیکرِ عمل اور سراپا کردار ہو جاتی ہیں۔ اگر برسات کی بہاریں لوٹنی ہیں زندگی کے مزوں سے ہم کنار ہونے کی آرزو ہے تو کمرِ ہمت کس لو۔ یہ سارے مزے تمھارے ہی لیے ہیں ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

برسات سے سبق لینا چاہیے، زندگی کو سراپا بہار بنا لینا چاہیے اسی میں سب کچھ ہے۔ اگر یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ ؏

کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے!

تعلیمِ نسواں

تعلیم ایسی شے ہے جس کے حاصل کرنے سے انسان کی سوتی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور زنگ آلود استعداد اُجاگر ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کلیہ صحیح ہے کہ تربیت کے بغیر تعلیم ناکارہ بلکہ بے سُود رہتی ہے اور اس کے اصلی جوہر نہیں کھلتے۔

تعلیم، جیسے مردوں کے لیے مفید ہے، ایسے ہی عورتوں کے لیے لیکن اگر تعلیم ناقص اور نامکمل ہے اور طرزِ تعلیم خراب ہے تو وہ تعلیم فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ اور مضرت رساں ہوتی ہے۔

بلاشبہ طرزِ تعلیم اگر بہتر ہو، تو تعلیم سے عمدہ نتائج حاصل ہوتے ہیں، اور اس وقت تعلیم، تہذیب کو ترقی دیتی ہے۔ اخلاقِ فاضلہ کی ترقی میں ممد ہوتی ہے۔ اور فنی قابلیتوں کو بڑھاتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی بدقسمتی سے مکالے سکیم کے ذریعے جس کو کلرک ڈھالنے کی مشین کہنا چاہیے وہ نظامِ تعلیم ہندوستانیوں پر مسلّط کیا گیا ہے۔ جس نے ایسے تعلیم یافتہ پیدا کیے جن میں زندگی کے دشوار گزار مراحل کو طے کرنے کی جرأت نہ رہی۔ قوتِ عمل ضعیف، قوتِ ارادہ کم زور اور اعصاب نمالہ ناکارہ ہو گئے۔ کام میں ہاتھ ڈالنے اور نہلانے کی ہمت جواب دے بیٹھی۔

اِدھر لڑکوں کا یہ حال ہے تو اُدھر لڑکیوں کی یہ کیفیت کہ ان پر بھی بلا سوچے سمجھے وہی نظام (تعلیم) لاد دیا گیا ہے، جس کے لیے نہ موزوں ہیں وہ اور نہ متحمل، اس ناروا کارروائی کا نتیجہ آرام طلبی بے حیا آزاد خیالی۔ اور

بے جا نمایش کی صورت میں جلوہ گر ہونا تھا اور ہوا۔

یہ اسباب تھے جنھوں نے یہ سوال پیدا کیا کہ عورتوں کو تعلیم دینی چاہیئے یا نہیں؟ لیکن چوں کہ لڑکیوں کا معاملہ ذرا نازک تھا اس لیے اس نے اہمیت اختیار کرلی اور اس مسئلے پر خیال آرائی شروع ہوگئی اور خوب ہوئی ورنہ یہ سوال جیسا لڑکیوں کے لیے تھا ایسا ہی لڑکوں کے لیے۔

سرسید، جو تعلیم کے بڑے حامی تھے۔ انھوں نے کہا، تعلیم، تربیت کے بغیر بے سود ہے۔ حالی ان کے ہم نوا تھے انھوں نے اس راگ کو یوں الاپا ہے:

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماتے — یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کے

اکبر نے بھی ایک کچوکا لگایا اور کہا

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

سر اقبال نے بھی اسی کے پیش نظر کہا

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشہ فرہاد بھی ساتھ

رفتہ رفتہ اصلیت نکھرتی چلی اور چکبست نے اعتراف کے طور پر کہا۔

"انگریزی تعلیم نے ملک میں رفتہ رفتہ جو بیداری پیدا کی ہے، اس سے

بھول جانا قومی احسان فراموشی ہے۔ مگر اس تعلیم کا ایک صریح اثر ہمارے
قومی اخلاق پر بہت خراب پڑا۔ وہ یہ کہ تعلیم محض ذریعۂ معاش ہو گئی
علم و ادب کی تحصیل سے جو روحانی سرور کا سرمایہ دلوں کو حاصل ہوتا ہے
وہ بالکل نظر انداز ہو گیا۔ .... وہ لطیف جذبات و خیالات
جن کا تازہ کرنا تعلیم کا اصل منشا ہے اور جن کی نشوونما سے انسان دنیا
کے گرد و غبار سے ہٹ کر روحانی لطافتوں کا حظ اٹھا سکتا ہے روز
بروز سرد ہوتے جاتے ہیں۔"

یہ تو تھی اس تعلیم کی کیفیت جس نے جنگ و جدل کا محاذ قائم کر رکھا تھا۔
اور ہی۔ لیکن ہونا کیا چاہیے وہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اپنی زبان سے بے نیاز
رہ کر نپپ سکی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔ تعلیم کا سب سے پہلا گر یہ ہے کہ وہ
اپنی زبان میں ہو اور ایسا نصاب مرتب کیا جائے جس سے جرأت عمل۔
کام کی لگن، بے جگری اور حوصلہ مندی پیدا ہو۔ ایسے نصاب ہمیشہ ملکی
زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی صورت میں غیر شعوری طور پر مرتب ہونے
لگتے ہیں۔ غیر زبان کے ذریعے علم حاصل کرنے سے یہی نہیں کہ علم نہیں آتا
بلکہ دماغ کو خراب کرتا ہے۔ بدمذاقی اور بداخلاقی کو پھیلاتا ہے۔ طبیعت کی
جودت اور صلاحیت کو کچل دیتا ہے۔

بلاشبہ لڑکیوں کو تعلیم دینا نہایت ضروری ہے۔ عورتوں کے تعلیم یافتہ
ہونے سے بچہ آدھی تعلیم گھر ہی میں حاصل کر لیتا ہے۔ ماں بہن اور گھر کی دوسری
مخدرات کی روشن خیالی سے بچہ کمینی اور چھچھوری عادتوں سے محفوظ رہتا ہے۔

اس کے اخلاق بلند اور اس کے عادات پسندیدہ ہوتے ہیں۔

تعلیم یافتہ عورت گھر کے لیے خدا کی رحمت ہے۔ شوہر کو اور اہل خانہ کو اس کی صلاح و مشورے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ بری اور فضول رسومات مٹتی چلی جاتی ہیں آمد و خرچ پر نظر ہوتی ہے۔ عسرت اور فلاکت کی نحوست گھر سے دور دور رہتی ہے۔

موجودہ تعلیم کیسی ہی سہی۔ لیکن اس کی بدولت عورتوں میں بیداری آتی چلی ہے۔ ان کو اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ البتہ ابھی وہ منزل دور ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان علم کی برکتوں سے بہرہ مند اور زندگی کے سرچشموں سے آنند حاصل کرتا ہے۔

عورتوں کو اپنی درسگاہیں خود کھولنی چاہئیں۔ اور ان کے انتظام کی باگ ڈور بھی اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیئے۔ عورتیں ابھی اس دوڑ دھوپ میں بہت پیچھے ہیں۔

بعض خصائص اور حالات و ضروریات میں عورت مرد مشترک ہیں اور بعض میں مختلف اور بے حد مختلف اس لیے ان کا نصاب تعلیم بھی ایسا ہونا چاہیئے جس میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ یہ نہیں کہ جو مردوں کو پڑھایا جائے وہی عورتوں کو بلکہ ضروریات کے لحاظ سے فرق ہونا ضروری ہے۔ عورتوں کا نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو ان کی فطرت کے مطابق ہو۔ اور ان کی ضروریات پر حاوی ہو۔

جس زبان میں نصاب کو پڑھایا جائے، وہ بھی ان کی فطرت سے قریب

ہونی چاہیے۔ کیوں کہ اس زبان کے ذریعے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے جس کو بچے نے آغوشِ مادر میں سیکھا ہے۔ وہ اس کی ذہنی اور دماغی قوتوں کو، قلبی استعداد اور تمام پوشیدہ صلاحیتوں کو اس طرح نشو و نما پہنچاتی ہے جس طرح کھیت پانی سے سیراب اور درخت کی پتیاں تر و تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے الٹ اگر کوئی غیر زبان ذریعۂ تعلیم ہوتی ہے تو کچھ قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اور کچھ نہیں اور یہ خرابی سخت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

نصاب میں کثرتِ مضامین سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے۔ آج کل اس قدر مضامین کا اضافہ کر دیا گیا ہے کہ جن کے تصور ہی سے دماغ مختل ہو جاتا ہے۔ کسی مہذب ملک میں یہ دستور ہے اور نہ کبھی تھا۔ یہ ہندوستان ہی کے لیے طغرائے امتیاز ہے کہ کونپل سے زیادہ نرم و نازک بچوں اور بچیوں کے دماغ پر کثرتِ مضامین کا انبار لادا جاتا ہے جس سے ان کے قوائے ذہنیہ ناکارہ اور قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں۔

مضامین کا رٹانا بھی قوتِ حافظہ کے لیے بے حد مضر ہے۔ استاد اور استانی کی سلیقہ مندی یہ ہے کہ بچوں اور بچیوں میں کتاب سے انس اور علم سے لگاؤ پیدا کر دیں۔ پھر جو کچھ درکار ہے وہ خود بخود ہو جائے گا۔ مگر اس گُر سے ہمارے اساتذہ اور استانیاں واقف نہیں۔

بچے متاثر ہوتے ہیں معلم اور معلّمہ کی شخصیت سے۔ اگر ان میں اپنے عمل اور اپنی خوش اسلوبی سے بچوں کی توجہ کو جذب کر لینے کی صلاحیت ہے۔ تو وہ اس منصب کے اہل ہیں ورنہ انھیں کوئی اور پیشہ اختیار کر لینا چاہیے۔

درس گاہیں اچھی اور جاذبِ توجہ ہونی چاہئیں۔ خوش نصیب قومیں وہ ہیں جن کی درس گاہیں عشرت گاہوں سے زیادہ پُرکیف اور قلعوں سے زیادہ مستحکم ہوں۔ درس گاہیں مادی اور فانی سہی۔ لیکن ان کے کھنڈرات بھی درسِ عبرت میں کم نہیں۔

بدنصیب قومیں ایسی عمارتوں کی تعمیر میں کاہل اور حیلہ جو ہوتی ہیں۔ اور جی چراتی ہیں۔ اور حیلے بہانوں سے راہِ فرار اختیار کرتی ہیں۔

تعلیم زندگی ہے۔ اگر تعلیم نہیں تو زندگی کا کوئی لطف نہیں۔ اس میں مرد ہو یا عورت سب برابر ہیں۔ تعلیم ہی بڑی نیکی ہے۔ تعلیم کے بغیر نہ خدا حاصل ہوتا ہے اور نہ خود شناسی۔ جہالت تاریکی ہے اور گمراہی جاہل کا کوئی بھی کام نہیں سدھرتا۔ اس لیے بہبودی کی خواہش ہے تو تعلیم حاصل کرو اور تعلیم بھی ایسی جو تربیت کی جامع ہو۔

پڑھو اور پڑھاؤ سیکھو اور سکھاؤ

اسی میں سب کچھ ہے۔ ع

کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے

شاعری کی اہمیّت و حقیقت

مُسَلّم ہی، کہ جب کسی چیز سے جائز و ناجائز ہمہ قسم کے فائدے اٹھائے جانے لگتے ہیں تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا، اور معیوب سمجھی جانے لگتی ہی۔ ہماری شاعری جو کل تک طرۂ امتیاز تھی، آج اسی ناوکِ غلط کاری کا نشانہ بن کر بدنام ہی، لیکن مبصرین جانتے ہیں کہ شاعری کا بذاتہٖ خود قبیح ہونا تو درکنار۔ تہذیبِ اخلاق و شائستگیِ خیالات کے لیے شاعری ایک نہایت ضروری چیز ہی۔

ماہرینِ تعلیمات کا متفقہ فیصلہ ہی، کہ ایسی تعلیم جو کچھ قوتوں کو اُبھارے اور کچھ کو نہیں وہ سود منداور نفع بخش ہونے کی بجائے سخت مضرت رساں اور نقصان دہ ہوتی ہی۔ اور ظاہر ہی کہ جب تک نثر کے ساتھ نظم داخل نصاب نہ ہو تکمیلِ ادب نہیں ہوتی گویا کہ شاعری بھی جزوِ تعلیم ہی جس کے بغیر تعلیم ناقص و نامکمل اور مضرت رساں ہوتی ہی۔۔۔۔

مسئلۂ ارتقار کا محقق مسٹر ڈارون جو علمی دنیا کا آفتابِ درخشاں سمجھا جاتا ہی، تحقیقِ مسئلہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنی خود نوشت سوانح حیات میں رقم طراز ہی:۔

"شاعری تھکے ہوئے دماغ کو آسودگی بخشتی ہی"

"تیس برس کی عمر تک بلکہ اس کے بعد تک شاعری کی اکثر صنفوں میں مجھے بہت لذت ملتی تھی، اور جب میں مدرسے میں پڑھتا

تھا تو اس وقت بھی شیکسپیر کے کلام میں خاص کر اس کے تاریخی ڈراموں میں بہت ہی لطف آتا تھا ....

لیکن اب کئی سال سے ایک مصرع پڑھنا بھی میری قوت برداشت سے باہر ہے .... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دماغ ایک مشین ہو کر رہ گیا ہے، جس کا کام یہ ہے کہ حادثات اور واقعات کو جمع کر کے ان سے عام اصول اخذ کیا کرے، مگر میرے دماغ کا صرف وہی حصہ کیوں بے کار ہو گیا جس پر احساسات لطیف کا دارومدار ہوتا ہے ....

اگر مجھے پھر سے اپنی زندگی مل جاتی تو کم سے کم ہفتے میں ایک بار کچھ شعر پڑھ لینا، اور کچھ موسیقی سن لینا اپنا معمول کر لیتا، اس تدبیر سے مرے دماغ کے وہ حصے جو اب بے کار ہو گئے ہیں مردہ نہ ہونے پاتے، ان دلچسپیوں کا مٹ جانا، مسرت کا معدوم ہو جانا اور چوں کہ اس سے ہمارے نفس کا وہ حصہ کم زور ہو جاتا ہے جس کا تعلق جذبات سے ہے، اس لیے یہ ہمارے ذہن کے لیے اغلباً ہمارے اخلاق کے لیے مضر ہے۔[1]"

مزید براں امریکہ کا مشہور ماہر نفسیات پروفیسر جیمس اس کی تائید میں لکھتا ہے:-

"ڈارون کے اس بیان سے لوگوں کو سبق لینا چاہیے اور

---

[1] ہماری شاعری ص ۱۸۔ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۵ء۔

ہر شخص کو کم سے کم دس منٹ روز شعر و شاعری کے لیے وقف کر دینے چاہئیں تاکہ جذبات مردہ نہ ہوں[۱]۔"

امور متذکرہ کے علاوہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہو کہ اقوال مذکورۃ الصدر کسی شاعر کے نہیں، بلکہ ایک فلسفی کے غور و فکر کا نتیجہ اور ایک شہرۂ آفاق سائنس داں کے ذاتی تجربات کا خلاصہ ہیں جو شاعری کی اہمیت اور ضرورت کے بہترین ادلہ ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ فلسفہ اور سائنس ہی شعر کے جانی دشمن ہیں جب یہی مؤید ہوں تو مزید دلائل کی کیا حاجت۔ کسی نے خوب کہا ہو ؂ مزہ جب ہی کہ یار کے مدعی سے مدعا نکلے

اور واقعہ میں صداقت کی بہترین دلیل بھی یہی ہو، ہاں اب یہ بھی سمجھ لیجیے کہ شاعری کہتے کس کو ہیں؟ اس مسئلے پر زمانہ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک برابر نکتہ چینیاں اور تخئیل آرائیاں ہوتی چلی آئی ہیں، لیکن یہ سب ہی کے نزدیک بالکل صحیح ہو کہ شاعری جذبات کی ترجمانی کا نام ہو۔ جناب صفیؔ فرماتے ہیں۔ ؂

شاعری کیا ہو؟ دلی جذبات کا اظہار ہو
دل اگر بیکار ہو تو شاعری بیکار ہو

دنیا کی چہل پہل اور رونق، غم و الم کے جاں فرسا سانحے وصل و ہجر کی جگر خراش داستانیں، ایجادات و اختراعات کے حیرت انگیز کرشمے غرض کہ جملہ کاروبار عالم کا انحصار جذبات اور زندہ دلی ہی پر ہی۔ اگر

[۱] ہماری شاعری ص ۱۹ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۵ء

جذبات مردہ ہو جائیں، اور زندہ دلی باقی نہ رہے تو دنیا اندھیر ہو جائے۔ کاروبارِ عالم کا شیرازہ منتشر ہو جائے اور قنوطیت پژمردگی کے سیاہ بادل چھا جائیں، اور تمام فضا مکدر ہو جائے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

پس ایسی اہم ترین چیز کو کیسے بیکار سمجھا جا سکتا ہے، البتہ جو خرابیاں ہوں، ان کا تدارک اشد ضروری ہے۔ اس کے لیے مناسب تدبیر یہ ہے کہ ملکی، قومی، اور نیچرل مضامین نظم کیے جائیں، مگر یہ نہیں کہ بیکار بے روح ہوں۔ بلکہ جذبات ہوں اور انھیں موثر اسلوب میں ادا کیا گیا ہو۔ کیونکہ دراصل شعر وہ ہے جو جوش و خروش اور ولولے سے پُر ہو، اور خوابیدگانِ غفلت کو خوابِ مدہوشی سے بیدار کر کے شاہراہِ ترقی پر گامزن کر دے حالیؔ اور بائرن کے شاہ کار اس کی بہترین مثال ہیں۔

لہذا یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا، کہ شاعری فی الواقع ایک بہترین چیز ہے اور اس کا صحیح استعمال ترقی کے لیے نہایت اہم اور ضروری ہے۔

عناصرِ شاعری

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

یہ مسئلہ عناصر شاعری بھی دیگر مختلف فیہ مسائل کی طرح ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور اکثر محققین کی جولانگاہِ تخئیل رہا ہے۔

دنیائے تحقیق کے بابائے آدم حکیم ارسطاطالیس کے نزدیک تخئیل و مصوری شاعری کے عناصر اصلی ہیں۔ علمائے منطق محض اثر، اور علمائے عروض محض موزونیت بتاتے ہیں۔ مگر علامہ شبلی کی تحقیق میں تخئیل و محاکات شاعری کے اصلی عناصر ہیں اور یہی قول بروئے تحقیق راجح اور مقبول سمجھا جاتا ہے۔

اگرچہ ان ہر دو اجزائے شاعری کی تفصیل طول طلب مباحث ہیں، لیکن مختصر یہ ہے کہ سر ہنری لوئیس کے نزدیک قوتِ تخئیل وہ قوت ہے "جو ان اشیاء کو ہماری نظروں کے سامنے لاتی ہے۔ جو غیر مرئی اور لطیف ہونے کی وجہ سے یا ہمارے حواس کی کمی کے سبب نظر نہیں آتیں گویا کہ قوتِ تخئیل ایک قسم کی اختراعی قوت ہے۔ جو نئی چیزوں کو عالمِ وجود میں لاتی ہے۔

چناں چہ جب یہ قوت فلسفے اور سائنس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو بڑے بڑے رموزِ دقیقہ کے حل اور ایجادات و اختراعات اور انکشافاتِ

جدیدہ کا ذریعہ بنتی ہے اور جب شاعری میں اس سے کام لیا جاتا ہے تو یہ اچھوتے مضامین، نئے نئے اسلوبِ بیان اور جذبات و احساسات میں تحریک و ہیجان پیدا کرنے کے لیے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتی ہے۔

نیز مسلمات کی ماہیت کو بدل لینا بدیہی کو نظری اور نظری کو بدیہی قرار دینا حساس کو غیر حساس ثابت کرنا۔ معلومات کو مرتب کرکے نئے نئے نتائج اخذ کرنا، خیالی اور حقیقی اشکال کا نقشہ اتارنا۔ دلچسپ اور دلآویز پیرایۂ بیان ایجاد کرنا۔ ایک ہی چیز کو مختلف پہلوؤں سے اور مختلف حیثیتوں سے دیکھنا اور ہر مرتبہ ایک نئی بات اخذ کرنا موجوداتِ عالم کو دقیق نظری سے دیکھنا۔ اور متضاد و متقابل اشیا میں صفاتِ مشترک پیدا کر دکھانا، فطرتِ انسانی کے دل نشین جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنا، وغیرہ وغیرہ کارہائے نمایاں سب اسی کی کرشمہ سازیاں اور طلسم کاریاں ہیں۔ چناں چہ ارسطو کے حیرت افروز کارنامے اور ہومر اور فردوسی کے شاہکار اسی کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ یہ قوت جس زور و شور سے ارسطو میں کام کر رہی تھی اسی قوت و طاقت کے ساتھ ہومر اور فردوسی کے دل و دماغ میں نمایاں تھی۔ اور اس عنصر کو ایسی اہمیت حاصل ہے کہ محاکات میں جو شاعری کا عنصر ثانی ہے۔ اگر تخیل کی آمیزش نہ ہو تو وہ بھی بے اثر رہتا اور محض نقالی متصور ہوتا ہے۔ اور بکار آمد ثابت نہیں ہوتا۔

محاکات ہو بہو نقشہ اتارنے اور خاکہ کھینچنے کو کہتے ہیں اور اکثر

واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر سیدھے سادھے الفاظ میں ان کا چربہ اتار دیا جائے تو کوئی اثر یا دلآویزی پیدا نہیں ہوتی، اور مقصدِ شاعری فوت ہوجاتا ہے۔ مثلاً کسی کا یہ شعر ؎

چشمانِ تو پیشِ ابر دانند
دندانِ تو اندرونِ دہانند

لہذا شاعر، یا مضمون نگار کو جب کائناتِ عالم کا نقشہ کھینچنا ہو تو تخئیل کی آمیزش کے بغیر کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ کیوں کہ شاعر اور مضمون نگار کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ موجوداتِ عالم کا نقشہ کھینچے تو اپنے سحر نگار قلم کی کرشمہ سازی اور تخئیل کی آمیزش سے ایسا طلسمِ حیرت بنائے کہ قدرت کی گلکاریاں اور نیچر کی نیرنگیاں آنکھوں کے سامنے پھر جائیں، اور دل چمنستانِ قدرت کے لہلہاتے اور سرسبز خیابانوں کی نسیمِ روح پرور سے لطف اندوز ہونے لگے۔

اسی طرح جب فطرتِ انسانی یعنی اموراتِ ذہنیہ اور وارداتِ قلبیہ کی ترجمانی کرنی ہو تو نفس کی تہ نشین کمزوریوں اور دل کی پوشیدہ خامیوں کی وہ چلتی پھرتی تصویریں اتارے کہ سننے والے بے ساختہ کہہ اٹھیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یاد رکھیے کہ شعر یا (مضمون) میں یہ خوبی نہیں تو وہ شعر (یا مضمون)

ہی نہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہوں موئے دم ذکر نہ ٹپکے خونناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

مختصر یہ ہے کہ شعر کی ماہیت وحقیقت اور اس کے اثر کا راز محاکات میں اور جوش، اثر، تاثیر اور اشتعال جذبات کا راز تخئیل میں مضمر ہے اسی وجہ سے ان ہر دو عناصر کو عناصر شاعری کہتے ہیں۔ اور حقیقت میں جب تک یہ دونوں مشتمل نہیں ہوتے۔ شعر اپنے تمام اوصاف واثرات کے اوپر حاوی نہیں ہوتا۔ اور پڑھنے والوں کو بھی پورا پورا حظ نہیں آتا۔

لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تخئیل اور محاکات دونوں شاعری کے اصلی عنصر ہیں۔

اب ہمیں کیا کرنا ہے؟

انگریز کی غلامی کا دور ختم ہوا۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اگرچہ انگریز کے ایجنٹ ابھی تک ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں۔ لیکن کارگر نہ ہوں گی۔ اور جس دور سے ہم گزرے ہیں اور جو خون خرابہ ہم نے دیکھا ہے وہ سب ان ہی کا کیا دھرا ہے۔ اخبارات میں وہ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ جو جاسوس بنانے کے لیے لکھے گئے۔ اور پکڑے گئے۔ اور جن سے یہ ابتری

پھیلی اور جو ہمارے بیان کی صداقت کی روشن دلیل ہیں۔
یہ سب کچھ کیا گیا تھا انگریز کو واپس لانے کے لیے اور کیا جا رہا ہی مگر اب ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ انگریز کے ایجنٹ فرقہ پرست ہندو بھی ہیں۔ اور مسلمان بھی۔ اس لیے جو کچھ ہوا وہ ان ہی کے ہاتوں ہوا۔ مگر اب پول کھل گئی ہی۔ اور بھانڈا پھوٹ چکا ہی۔ اس لیے اب ایسا کچھ ہونا مشکل ہی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اور ایسا کچھ ہو چکا کہ ندامت سے گردنیں جھک گئیں اور سب کی آنکھیں کھل گئیں اور سب نے سمجھ لیا کہ کیا کچھ ہونا تھا۔ اور کیا کچھ ہو گیا۔
اب ملک آزاد ہی۔ سب ہی حاکم اور سب ہی محکوم ہیں۔ ہندوستانی حکومت ہندوستان میں رہنے والوں کی حکومت ہی جو یہ کہتا ہی یا سمجھتا ہی کہ ہندو حکومت ہی مسلمان حکومت ہی وہ ہندو ہی یا مسلمان یا کوئی اور وہ جھوٹ بولتا ہی اور غلط سمجھتا ہی اس کی بات قابلِ اعتماد نہیں۔
لہذا اب ہر ہندوستانی کا فرض ہی کہ وہ اپنے ملک کو جنت بنانے کی کوشش کرے۔ ۵

لطف جینے میں ہی کیا اہلِ وفا جب کہ وطن
رشکِ فردوس نہیں غیرتِ گلزار نہیں

اس نوعیت سے ہمیں کئی اہم کام درپیش ہیں۔ ہمیں اپنے اخلاق کی اصلاح کرنی ہی۔ تعلیم کو فروغ دینا ہی۔ اور اپنے ملک سے افلاس اور تنگ دستی کو دور کرنا ہی اور یہ ہمیں مل جل کر کرنا ہی۔
(۱) اخلاق کی اصلاح ہوتی ہی۔ مذہبی ہدایات پر عمل کرنے سے

مذہب کے نام سے آپ کے کان کھڑے ہوئے ہوں گے۔ مگر ٹھیک نہیں۔ مذہب بری شئی نہیں۔ البتہ مذہب کو غلط استعمال کرنا بری شئی ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اس میں شک نہیں کہ بہت سے گناہ مذہب کی آڑ میں کر لیے جاتے ہیں مگر اس سے مذہب کی تاثیر کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی قباحت ظاہر نہیں ہوتی۔ چاقو کا استعمال یہ ہے کہ قطع برید میں سہولت بہم پہنچائے یہ نہیں کہ گلے پر چلایا جائے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ اس کے استعمال کی غلطی ہے۔ چاقو کا قصور نہیں۔ رسی ہمارے۔۔۔۔ رات دن کام آتی ہے۔ پھر اگر کوئی اس سے پھانسی لگا لیتا ہے تو اس میں رسی کی کیا خطا۔ یہ صحیح ہے کہ غلط استعمال ہی نے مذہب کو بدنام کیا ہے اور غلامانہ ذہنیت نے اسے اپنایا اور رسوا کیا ہے ورنہ فی الحقیقت مذہب تو ایسی چیز ہے کہ جس کی پیروی سے عجائبات جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مذہب کی راہ نمائی ہمیں گناہوں سے بچاتی ہے۔ مذہب ہی ہمیں اچھے اخلاق سکھاتا ہے۔ ہم حکومت کے خوف سے ظاہری گناہوں سے اجتناب کر سکتے ہیں مگر جو بدی دل میں آتی ہے اور ہم چھپ لپ کر اسے کر لیتے ہیں۔ اس کے ارتکاب سے اگر ہم بچ سکتے ہیں تو صرف مذہبی ہدایت سے یا مذہبی تنبیہ سے۔ غرض کہ اخلاق و اطوار کی اصلاح کے لیے ہمیں بالیقین مذہبی ہدایات ہی کی طرف متوجہ ہونا ہوگا۔

ہم جھجکتے اس لیے ہیں کہ انگریزی کی غلامی نے ہمارے ذہنوں میں بے اعتمادی کی غلاظت بھر دی ہے۔ ہم انگریز کی ٹکساری پر چلنے کے ایسے عادی

ہو گئے ہیں کہ سوچتے ہیں تو انہی کے ڈھنگ پر بولتے ہیں تو وہی بولیاں جو اس نے سکھائی پڑھائی ہیں۔ ہمارے نزدیک وہی معزز ہے جو انگریز کا دم چھلہ ہے۔ مگر اب انگریز کی ترکی تمام ہوئی۔ یہ بھی اسی کا کہنا تھا کہ مذہب بُری چیز ہے۔ اب نہ وہ رہا نہ اب اس کی پھبتی چل سکتی ہے۔ اس نے یہ کہہ کر فرقہ پرستی کا بیج بویا تھا اور ہم اس کے ہاتھوں کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ہدایت کا سورج نکل آیا ہے۔ آزادی کی روشنی پھیل گئی ہے۔ غلامی کی ظلمت ملیامیٹ ہو گئی ہے۔ اب حق کہا جائے گا۔ اور سچی بات پر عمل کرنا ہو گا۔ بد ترین ذہنی پستی کی اچھی دلیل یہ ہے جو انگریز نے کہا وہ ہم نے مانا اور اس پر عمل کیا اور اسے یقین کی روشنی بلکہ روشن خیالی سمجھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ عیب اب بھی کسی کسی میں شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

مسلمان ہونا۔ ہندو ہونا۔ سکھ ہونا وفاداری کا تمغا ہے اور نہ غداری کا طوق درحقیقت جو ملک کو نقصان پہنچاتا ہے جو حکومت کے کاروبار میں خلل انداز ہوتا ہے جو عوام میں ہراس اور ہیجان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہو۔ ہندو ہو مسلمان ہو۔ سکھ ہو ملک کا غدار ہے اور وہ قانونی گرفت میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بات بڑھ گئی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ مذہب بُری چیز ہے تو اس کی بات کسی اعتبار سے ماننے کے قابل نہیں اور یہ کہا بھی کس نے تھا انگریز نے اور یہ کہہ کر ہمیں احمق بنایا تھا اور ہم میں فرقہ پرستی پھیلائی تھی اور یہی ہمارے خان بہادر اور رائے بہادر یعنی انگریز کے

بناؤ۔ لی بہادر خوشامدی ٹٹو۔ آپ کہہ لیجیے۔ اناڑی اور نکمے اور بن کوڑی کے غلام۔ اپنے آقا کی اس لعنت کو ہم پر مسلط کرتے رہے اور ایجنسی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ بھائی سے بھائی کو اور باپ سے بیٹے کو جدا کر دیا۔ کاٹ کی ہنڈیا اور کاغذ کی ناؤ کب تک چلتی ہے۔ انگریز کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ یہاں سے رفوچکر ہو گیا مگر ابھی اس کی ذرّیات باقی ہے۔ یہ بھی عنقریب خود کشی کرے گی۔

آپ مذہب سیکھیے اور بڑے شوق سے سیکھیے اور اخلاق کو سدھاریے اسی میں دین و دنیا کی فلاح ہے۔ ہر مذہب کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ اگر وہ ہدایت محفوظ ہے تو اس کے سوا اور کسی شے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہدایت اپنے بازو پھیلائے کھڑی ہے کہ اپنے آغوشِ رحمت میں آپ کو چھپا لے مگر ذرا قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ادھر بڑھے ادھر آغوشِ رحمت میں لے لیے گئے۔ آپ ہی سب کچھ ہوں گے اور آپ ہی کے لیے سب کچھ ہوگا۔ آپ سے کیا کہوں کہ کیا ہوگا۔ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں!
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اچھا تو کون ہے جو یہ چاہتا ہے کہ باعزت زندگی گزارے۔ اس کی بات میں اثر ہو۔ دنوں میں اس کی عزت ہو۔ دنیا کی دولت اس کی ٹھوکروں میں ہو۔ اپنے بیگانے اس کی بات مانیں۔ دشمنوں کے دل اس کی دہشت

سے دہل جائیں۔ اس کے روبرو لب کشائی کرنے سے تھرتھرا اٹھیں۔ ایک نگاہِ غضب سے کانپ جائیں اور اس کے مہر و محبت سے دلوں کے زنگ دھل جائیں۔ اس کے التفات سے بگڑی قسمت بن جائے اور وہ کیمیا نہیں بلکہ کیمیاگر بن جائیں وہ آگے بڑھے اور سیکھ لے۔ تل اوجھل پہاڑ ہے۔ مجھ سے سیکھو میں سکھاتا ہوں بتاتا ہوں۔ گردن کٹے آرے چلیں۔ سچ ہی بولیں گے۔ جھوٹ ہرگز نہ بولیں گے اور اس پر ثابت قدم رہیں گے۔ دیکھو کل ہی سے بلکہ آج ہی سے بلکہ ابھی سے کیا کچھ ہوتا ہے۔ آپ اپنے کو ایک نور کی دنیا میں پائیں گے۔ ظلمت پاک و صاف دنیا میں پائیں گے۔ گناہوں کی نحوست اور بے عملی کی غلاظت دور ہوتی نظر آئے گی اور ایسا معلوم ہونے لگے گا کہ ایک بڑی تکان کے بعد میٹھی نیند سو کر آپ اٹھے ہیں اور اب ہشاش بشاش ہیں اور وہ بوجھ کہ جس نے دبا رکھا تھا اور دبوچے دیتا تھا کندھوں سے اتر گیا ہے۔ خیالات میں نظافت اور پاکیزہ پن آجائے گا۔ طبیعت ہلکی پھلکی ہو گی۔ دل میں سرور آنکھوں میں نور ہو گا۔ دنیا میں ایک عالم گیر محبت جلوہ گر نظر آئے گی۔ میں آپ سے کیا کہوں کہ کیا کچھ ہو گا۔ آپ اپنے عہد پر کاربند رہیں۔ یہ پہلا قدم ہے۔ یہ قدم اٹھا تو پھر آگے اور بہت سی منازل ہیں اور بہت سے فضائل ہیں اور بہت سے مقامات ہیں۔ اس عہد پر کاربند رہنا آپ کو متوجہ کرے گا کہ آپ ایک قدم اور آگے بڑھیں یہاں تک کہ آپ براہِ راست دین سے ہدایت لینے کی صلاحیت اپنے میں پانے لگیں گے اور کامیابی و کامرانی کے سرچشمے پر جا پہنچیں گے۔

(۲) اس کے بعد ہی تعلیم کو فروغ دینا۔ اس سے میری مراد یہ ہی کہ ضرورت کے مطابق ہر شخص کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ تعلیم کو عام کر دینا چاہیے اس کے فروغ کے لیے تن من دھن سے کوشش کرنی چاہیے۔ مادی ہوں یا روحانی ساری ترقیات کا مدار تعلیم ہی پر ہی اس کے لیے وقت نکالیے اور وقت دیجیے دوسروں کو پڑھایئے اور خود بھی مطالعہ وسیع کیجیے۔ علم اور اس کو فروغ دینا اور پھیلانا بڑا ضروری ہی اَن پڑھ کو پڑھا لیا تو یہ سمجھیے کہ اندھے کو بینائی بخش دی کیا وہ دل سے دعائیں نہ دے گا۔ خوش نصیب علم کے پروانے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ متمدن اقوام میں علم کا چرچا رہا ہی۔ قلم کی طاقت مالی اور جسمانی طاقت سے کہیں زیادہ اور افضل ہی۔

علم روشنی ہی نور ہی تاریکی سے نجات ہی اور بہت بڑی نیکی ہی۔ جو اس نیک کام کو انجام دے گا قیامت تک اس کا اجر پائے گا بلکہ ابدالآباد میں بھی اس کا پھل پائے گا یہ کام کیجیے اور صرف خدا کے لیے کیجیے جز منفعت حصولِ اقتدار و شہرت یا چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے نہ کیجیے۔

بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیجیے اور بالغوں کی تعلیم کا بھی۔ اب بوڑھے توتے بھی پڑھنے لگے ہیں۔ وہ مثل پرانی ہو چکی جو آپ کو یاد ہو گی۔ کیا اچھی بات ہی جو لوگوں میں اتنا شوق پیدا ہو جائے کہ وہ دوڑے دوڑے آپ کے پاس آئیں اور ذوق و شوق سے پڑھیں نہیں تو یہ آپ کا فرض ہی کہ آپ خود دوڑے دوڑے جائیں اور انھیں پڑھائیں بڑی اچھی بات ہی اور بڑے ثواب کی بات ہی۔ آپ کو معلوم ہی کہ جب کوئی طالب علم پڑھنے

کے لیے مدرسے کی طرف قدم اٹھاتا ہی تو ہر ہر قدم پر فرشتے اس کے پیروں کے نیچے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے جب طالب علم کی یہ قدر و منزلت ہی تو جو شخص خود پڑھانے جا رہا ہی اس کا کیا مرتبہ ہوگا۔

اگر کچھ کرنا ہی یہ کام کیجیے ورنہ آنے والی نسلیں تبرا بھیجیں گی۔ جوتیاں ماریں گی اور آپ سے زبردست باز پرس ہوگی اس وقت قوم کو تعلیم کی ازحد ضرورت ہی یہ مانا کہ افراد کی سیرت و کردار ان کے اعمال و افکار کی اصلاح بھی ضروری ہی مگر تعلیم کے بغیر ہر قسم کی اصلاحی جد و جہد بے کار ہی اس کی پہلی سیڑھی تعلیم کی اشاعت ہی۔

آپ دوڑے دوڑے پھریے وقت صرف کیجیے اور تعلیم کی اشاعت میں جان کی بازی لگا دیجیے۔ آپ کہتے ہوں گے کہ تعلیم کی ضرورت تو مسلّم لیکن یہ کیا کہ ہم دوڑ لگاتے پھریں۔ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہی یا کنواں پیاسے کے پاس آتا ہی۔ یہ کیا الٹی گنگا بہائی ہی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ حضرت الٹی نہیں سیدھی ہی۔ عقل اوندھی ہو تو ہر شے اوندھی نظر آتی ہی۔ آپ اس کو اپنی ضرورت سمجھیے اگر اپنی ضرورت نہ سمجھیں گے تو کام ہرگز نہ ہوگا۔ جس طرح آپ اپنی ضرورت سے چھتیس پھیرے کرتے ہیں۔ اور در بدر مارے پھرتے ہیں، اسی طرح اس کام کے لیے بھی دوڑ دھوپ کیجیے آپ کا نام بقائے دوام کے سنہری حرفوں سے صحیفۂ عالم پر نقش ہوگا جو کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا۔

در اصل بات یہ ہی کہ ذہن اندھے کنوئیں بنے ہوئے ہیں جو منھ میں

آیا کہہ دیا. کرنا دھرنا کچھ بھی نہیں ایسی تحریکیں جو عمل سے عاری ہوں قالبِ بے جان ہیں۔ میں انھیں ہڑ بازی کہا کرتا ہوں۔

بھائیو! کنوئیں کھائی کے چکر سے نکلو۔ دریا بنو، سمندر بنو. خاک بنے جو کنواں بنے کھائی بنے۔

آپ کا فرض ہے کہ آپ تھوڑا وقت دیں۔ اور جاہلوں کو سواد خواں اور حرف شناس بنا دیں. وہ تا بہ عمر آپ کے غلام بنے رہیں گے۔ یہ محنت سے شوق سے اور لگن سے کرنے کا کام ہے۔ آپ کام تو کیجیے پھر دیکھیے آپ کی آواز صدا بہ صحرا بن کے رہ جاتی ہے یا موثر ہوتی ہے کام کرنے سے ہوا کرتے ہیں۔ پڑے رہنے سے کچھ نہیں بنتا. اگر سجادہ اور مصلیٰ ہی کافی تھا تو خواجہ معین الدین چشتیؒ اور دوسرے اکابر ہل کر پانی بھی نہ پیتے مگر کام کرنے ہی سے ہوتے ہیں۔ پڑے رہنے سے نہیں۔

کل کا موذن ایسا نہ تھا جیسا آج کا ہے وہ کاروبار بھی کرتا تھا. قوم کی خدمت بھی کرتا تھا۔ جب ہی اس کی آواز میں یہ تڑپ اور یہ تاثیر تھی کہ ادھر اس نے حی علی الصلوٰۃ کہا ادھر قوم اس کی آواز پر دوڑ پڑی یہ تو نہ تھا کہ گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخا کیا اور کسی کے کان پر جوں بھی نہ رینگی. یہ ہے بے عملی اور تعطل کا خمیازہ۔ اس موذن کو معلوم نہیں کہ پڑوسیوں کا اس پر کیا حق ہے۔ اس نے اپنے کو صرف اذان کے لیے مخصوص کر لیا ہے حالاں کہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی خوش اخلاقی اور ملنساری سے اور کچھ نہیں تو خوشامد درآمد ہی سے اپنے پڑوسیوں میں نماز کی لگن پیدا کر دے

بہت کیا تو چھدا اتارنے کو چھوٹے موئنہ پونچھ لیا تو بھی یہ بات ٹھیک نہیں۔ پرجاؤ اور اتنا پرجاؤ اور اتنے لگے رہو کہ آخر وہ آپ کا ہو رہے۔ دھکیلم دھکالا سے کام نہیں چلتا یہ کام چلتا ہی عملِ پیہم سے یقینِ محکم سے محبت اور پیار سے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
مصافِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

الغرض جیسے بن پڑے بے پڑھوں کو پڑھایے اور پڑھنے پڑھانے کی ضرورت کو محسوس کیجیے۔ آپ کی بستی میں ایک بھی ان پڑھ نہ رہنے پائے پھر دیکھیے اس کی بہار۔ یہی بستی جس میں گندی نالیاں بہہ رہی ہیں ناہموار راستے ہیں۔ ہر مالک مکان فرعونِ بے ساماں ہے کل یہی گلیاں باغ کی روشیں ہوں گی۔ یہی کچی پکی جھونپڑیاں صفائی اور ستھرائی میں محلات کے ہم دوش ہوں گی اور یہ سب کچھ تعلیم کی برکت سے ہو جائے گا۔ وہی ادرمیراقی جواب بہکی بہکی باتیں کرتے پھرتے ہیں سنجیدہ اور دور اندیش نظر آئیں گے ان کے خیالات میں پاکیزگی ہوگی۔ حوصلے بلند ہوں گے زبان سے جو بات نکلے گی اس کا اثر ہوگا اور وہ دل کی گہرائیوں میں بیٹھ جایا کرے گی۔

غرض کہ اس موضوع پر جتنا بھی کہا جائے تھوڑا ہے۔ بہت سی کہنے کی باتیں ہیں جو آپ سے کہنی چاہئیں۔ مگر داستان طویل ہو جائے گی اس لیے اب ایک قدم اور آگے بڑھایے۔ اور ہمت و جواں مردی سے کام لیجیے۔

اب لیجیے تیسری شے یہ کیا ہے؟ یہ ہے — مفلسی اور تنگ دستی کو ملک سے دور کرنا آپ منتظر ہوں گے کہ اب بتایا کوئی کیمیا کا نسخہ اور اب لگے دولت کے ڈھیر۔ اس میں شک بھی نہیں کہ نسخہ تو کیمیا ہی کا ہے اور یہ کیمیا بنانی بھی پڑے گی آپ ہی کو اور تاؤ بھاؤ دیکھتے رہنا پڑے گا۔

سنیئے یہ ہے نسخہ کیمیا کا آپ نے دولت کی فراہمی کو مقدم بلکہ نصب العین حیات سمجھ لیا ہے اور اپنی پیدائش اور تخلیق کا سبب ہی یہ سمجھا ہے کہ دن رات کولھو کے بیل کی طرح چلے جائیں۔ نیکی بدی کچھ بھی کریں مگر چار پیسے بٹور لیں۔ اگر آپ کی جیب بھاری ہے تو آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ اِدھر اُدھر کی الٹی سیدھی کچھ بھی ہانک دیں آپ کے حاشیہ نشینوں کے لیے وحی ہے۔ انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سرتاسر غلط ہے اور اگر دولت فی الواقع کسی کو بڑا بنا سکتی ہے تو وہ قارون کو بڑا بناتی اور ساری دنیا اس کو بڑا مانتی۔

میں کہتا ہوں کہ آخر گدھا تو گدھا ہی ہے۔ ڈلاؤ لاد کر اسے لے جائیں تو آپ اشرفیوں کا ڈھیر رکھ کر اس پر لے جائیں تو اس میں کوئی سرخاب کا پر لگ جاتا ہے۔ آج اشرفیاں لدی ہوئی ہیں تو کل ملبہ یا ڈلاؤ ہے۔ دراصل دولت کسی کی ذات نہیں یہ تو حاجت روائی کی ایک چیز ہے۔ جس طرح حاجت روائی کے لیے گھڑی بھر کو پاخانے میں جا بیٹھے بس اتنی ہی بات ہے یا اور کچھ مگر اور کچھ ہے تو وہ آپ جانتے ہوں گے۔ یہ جملہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ "اَلسخی حبیب اللہ"........ سخی اللہ کا

دوست ہی۔ اور اس لیے کہ دولت کی غلاظت جو اس کو لتھڑی ہوئی تھی وہ اس سے دور ہوئی تو وہ اللہ کا دوست ہو گیا۔ ورنہ وہ پہلے اللہ کا دوست نہ تھا۔

اصل بات وہی ہی جو میں نے کہی کہ آپ نے حصولِ دولت کو مقدم سمجھ لیا حالانکہ اس کا درجہ یہ نہیں۔ یہ تو موخر ہی۔ زندگی کا مقصد نہیں وہ اور شی ہی۔ جو زندگی کا مقصد ہی اور نصب العین حیات ہی اور وہی مقدم ہی اور اسی کو موخر بلکہ ترک کر رکھا ہی وہ کیا ہی اللہ کے کام میں لگ جانا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ کیا کہا۔ ہمارے تو کان بھی اس آواز سے آشنا نہیں۔

ہاں یہ صحیح ہی کہ آپ کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ مقامِ فکر یہ ہی کہ ایسا کیوں ہوا یہ وہی انگریز کا فتنہ ہی۔ جو اس نے ہندوستان میں برپا کیا کہ اہلِ ہند مذہبی شعور سے نابلد ہو گئے۔ اور یہی وہ تدبیر تھی جس سے غلامی کی زنجیریں مضبوط ہو گئی تھیں۔

مقصدِ حیات یہ ہی کہ مخلوق کی خدمت کی جائے۔ نیکی کا پرچار کیا جائے اور جو کام کیا جائے اسی مقصد سے کہ مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ یہ کام ہر حیثیت سے نفع بخش ہو گا۔

اس کام میں جو وقت صرف ہو گا، جو دولت صرف ہو گی اس کا دس گنا منافع دنیا میں اور ستر گنا آخرت میں ملے گا۔ نفع اس میں بھی ہی۔ زندگی عزت سے اس طرح بھی گذر سکتی ہی۔ دولت کی ریل پیل بھی ہو گی۔ اور اس میں مضبوطی اور پایہ داری بھی ہو گی اور یہی ہر شخص چاہتا

بھی ہے۔ مگر اس راستے سے ہم بھٹک گئے اور گم راہ ہو گئے۔ غول بیابانی بن گئے۔ منافع بازی۔ لٹس۔ اور دھوکا دہی سے دولت فراہم کرنے کو عزت اور نام آوری سمجھنے لگے۔ جس میں پایہ داری ہے اور نہ اطمینانِ قلب۔ اس راستے پر ڈالا تھا ہمیں انگریز نے تاکہ ہم آپس میں ایک دوسرے کو نوچتے اور کھسوٹتے رہیں اور وہ ہم پر حکومت چلاتا رہے۔ مگر تابہ کے۔ انجام کار یہ طلسم ٹوٹ گیا اور ہدایت کی روشنی ہمیں نصیب ہو گئی۔

ہم کاروبار ضرور کریں گے۔ مگر دیکھ بھال کر۔ دوسروں کا آرام مقدم اور اپنا نفع موخر۔ ذرا سے خیال کے بدلنے سے کایا پلٹ جاتی ہے ہمیں دوسروں کی آسایش کا خیال ہو گا تو دولت کے ڈھیر ہماری ٹھوکروں میں ہوں گے بس اب ہر کاروبار میں ہمیں مخلوق کی خدمت، مخلوق کی آسائش اور مخلوق کی راہ نمائی پیش نظر رکھنی ہو گی۔ دیکھیے چند روز میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے ہر شخص کا اعتماد آپ کو حاصل ہو گا۔ ہر شخص کی خواہش ہو گی کہ وہ آپ سے کاروبار کرے حتیٰ کہ آپ اس مرتبے سے اور بلند ہوں گے۔ اور آپ کے اشارے سے اب دوسروں میں یہ خوبی پیدا ہو گی اور آپ ان کے لیے ایک ذریعے اور ایک راہ نما کا کام دیں گے۔ اور وہ ہر شعبے میں آپ سے ہدایت حاصل کریں گے۔ اور اسی طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا جائے گا۔ اور کائنات میں اتحاد، امن اور پریم کا ساگر بہتا نظر آئے گا۔ ایک دوسرے کا دوست اور بہی خواہ ہو گا۔ دشمنی اور لوٹ مار کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

انگریز نے ایسا ڈھنگ ڈالا تھا کہ ہم مہذب لیٹرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کی گھات میں لگا ہوا ہی اور اسی لوٹ مار کو زندگی کا مقصد اور عزت کا ذریعہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور یہی سرتاسر غلط ہی اور بدترین لعنت ہی۔

جب یہ چیز ختم ہو گئی اور ہم راہِ راست پر آگئے تو اب دشمن بھی دوست ہی۔ تصورِ آخرت بڑی چیز ہی انجام کا فکر انسان کو راہِ راست پر لگا دیتا ہی یہ نسخہ کیمیا ہی اگر ہم یورپ کی تقلید ترک کر دیں اور کاروبار کا صحیح راستہ اختیار کر لیں تو ہمیں کسی کاروبار میں ٹوٹا نہیں ہو سکتا۔

ہمیں چاہیے کہ نفع بازی چھوڑ دیں اور ہر کاروبار میں مخلوق کی خدمت کو مقدم سمجھیں۔ ہمارا ہر کام نفع بخش ہوگا۔ اور ہمارے ہاتھ زر افشاں اور دولت کے سوتے بن جائیں گے۔ اور یہ جو روٹی لنگوٹی کی فکر ہمیں کھائے جاتی ہی اس سے ہمیں نجات مل جائے گی اور ہم چین کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ کیا ہم سب ان ہدایتوں پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔ جو آزمودہ بھی ہیں اور نفع بخش بھی؟

اُردو کی ہمہ گیری

(الف) قومی زبان سے کیا مراد ہی؟ لینگوا فرنکا (ملکی عام زبان) یا کچھ اور؟ ہمارے نزدیک وہی زبان مراد ہی، جو ملک کی پیداوار ہو۔ ملک میں اسی کا چلن ہو، لہذا اب ہم جو اس عنوان پر غور کرتے ہیں۔ تو اس عنوان سے دو مفہوم نکلتے ہیں۔

(۱) اُردو زبان میں ہندوستان کی قومی زبان ہونے کی اہلیت ہی یا نہیں؟

(۲) دورِ حاضرہ میں اُردو زبان ہندوستان کی قومی زبان ہی یا نہیں؟

لہٰذا ان دونوں سوالوں کے حل کرنے کے لیے پہلے ہمیں یہ دیکھنا پڑیگا کہ وہ بنیادی اصول کیا ہیں، جو کسی زبان کی ہمہ گیری اور مقبولیت کے لیے درکار ہوتے ہیں؟ چناں چہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جب ہم "اقوامِ عالم کی لسانی تاریخ" پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں۔ اور وہ بھی اس پائے کی، کہ ان ہی کو لسانی سنگِ بنیاد ماننا پڑتا ہی۔

ان میں سے پہلی چیز "فطری استعداد" ہی۔ اور اس سے یہ مراد ہی کہ زبان کی تخلیق، نشو و نما، اور ترقی میں قدرت کا سلوک کہاں تک اس کے شاملِ حال ہی؟

دوسری چیز "جامعیت" ہی، اور اس سے مقصود یہ ہی کہ زبان میں معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے کی کہاں تک گنجایش اور صلاحیت ہی۔

اب ہمیں یہ تحقیق کرنا پڑے گا، کہ "اردو زبان" میں یہ دونوں اوصاف بہ قدرِ ضرورت موجود ہیں یا نہیں؟ چناں چہ اس کے لیے ہمیں "ہندوستانی السنہ" کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی، اور اس طرح پر کہ ہر جگہ سے "اردو زبان" کی تخلیق، نشو و نما، اور تدریجی ترقی کو پرکھنے کے لیے اسباب و علل کا سرمایہ مہیا ہوتا رہے۔

ہمیں ہندوستان کی قدیم اقوام کول بھیل کا علم ہی، اور ان کی بولیوں کے متعلق بھی معلوم ہو جاتا ہی، کہ تامل تلنگی تھیں، جو آج بھی جنوبی ہند میں پائی

جاتی ہیں، ہمیں ایرین قوم کی آمد و شد کے حالات کا بھی علم ہے، اور ان کی تہذیب و تمدن اور مقدس بھاشا، سنسکرت کا بھی، اور زبان کی تحدید اور چھوت چھات کے متعلق بھی کم و بیش واقفیت ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جبر و اکراہ کے باوجود، ڈشٹھ اقوام کی ملیشھ بولی پراکرت اور دیو بانی زبان سنسکرت، دونوں ایک ہی دربار میں ہم ردیف ہیں، یہ دربار مہاراجہ بکرماجیت، والئ اجین کا دربار ہے، اور یہ سماں "شکنتلا دیوی" کا ڈراما ہے، جس کی بدولت ہندوستان کے مہاکوی کالی داس کو حیاتِ جاوید حاصل ہے۔

راجہ بھوج، مہاتما بدھ، اور عہدِ منو سمرتی سے گزرتے ہوئے ہم کافی آگے نکل آئے ہیں اور اسی طرح آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ محمد بن قاسم کی آمد، عہدِ غزنوی کی برکات، مسلمان درویشوں، تاجروں، اور سیاحوں کی آمد و رفت غرض کہ یہ ساری باتیں ایسی ہیں، جو زبان کے عہد بہ عہد کے تغیرات کا پتہ دیتی ہیں۔

حتیٰ کہ مملکتِ سخن کے امیر الامراء کے عہدِ خسروی تک جا پہنچتے ہیں یہ وہی امیر خسروؔ ہیں جو اس بولی کے سب سے پہلے شاعر ہیں، اور ایسے مقبول اور شیریں کلام شاعر ہیں، کہ ہر کس دناکس حتیٰ کہ پن گھٹ کی پنہاریاں بھی، ان کے کلام کی مشتاق رہتی تھیں۔ ان کا عہد ہے، ۱۲۵۳ء (۶۵۱ھ) سے ۱۳۲۴ء (۷۲۵ھ) تک۔

"اردو زبان" ان ہی تغیرات کی ایک شایستہ صورت ہے، جو فطری

استعداد اور صلاحیتِ خاصہ کو لیے ہوئے، ہندوستان کے گوشے گوشے سے پھوٹ نکلتی ہے۔ اسی لیے یہ مسئلۂ پیدائش آج قابلِ بحث ہو گیا ہے، اور اسی لیے ہر صوبے کو یہ دعویٰ ہے کہ "اردو زبان" اسی صوبے کی پیداوار ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق کا منشا، ضروریات کی تکمیل ہے۔ اور اس کی صلاحیت و جامعیت کی روشن دلیل اس کی مقبولیت ہے، اور یہ ہی اوصاف ایک ترقی کرنے والی زبان کے لیے لازمی وصف ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب قبلہ کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ خطبات عبدالحق صہ ۲ پر ہے:-

"اردو کی سرشت اور ساخت اس قسم کی ہے، اور اس کی نشوونما اس ڈھنگ سے ہوئی ہے، کہ بلا لحاظِ قوم و ملت تقریباً سارے ہندوستان کی زبان ہے، یا ہو سکتی ہے۔"

اس بیان سے زبان کے دونوں پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ہر دو مفہوم کی اثباتی تائید ہوتی ہے۔ کہ اردو زبان، ہندوستان کی قومی زبان ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اور قومی زبان ہونے کی حیثیت سے، اردو ہندوستان کی قومی اور عام زبان ہے بھی، چناں چہ ان ہی خطبات کے صہ ۱۲۴ پر ہے:-

"ہمارے پاس ایک ایسی زبان ہے، جسے ہم "دیش بھاشا" کہہ سکتے ہیں،۔۔۔۔۔۔۔ اپنے ملک میں جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں، اور بولی جاتی ہیں، ایک ایسی زبان کا

ہونا لازم تھا" قانونِ قدرت" نے اپنا کام کیا،" انسانی ضرورت
نے اسے لبیک کہا، اور" رواج" نے اسے پھیلایا"۔
یہ ہی ہماری" دیش بھاشا" ہے، یہ ہی ملکی" اور قومی زبان" ہے کیوں کہ
اس کی تخلیق کی غرض وغایت ہی یہ ہی تھی"۔

"اردو زبان" سے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے، کہ شروع شروع میں" بھاشا، کو ہندی کہتے تھے، شاہ جہانی لشکر کی مناسبت سے اردو نام پڑا، منتشر زبانوں کی یک جائی کی بدولت ریختہ کہنے لگے، یورپ کے مصنف اس کو ہندوستان کی ہمہ گیر زبان ہونے کے نسبت سے ہندوستانی کہتے ہیں۔ چناں چہ اس کے متعلق فرانس کے بڑے نامور مستشرق پروفیسر" گارسان دتاسی" ۱۸۶۵ء کے خطبے میں فرماتے ہیں:۔

" اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کہ وہ سارے ہندوستان
کی مشترک زبان ہے"۔

ڈاکٹر جان گل گرسٹ، برٹش انڈیا مونٹر پریفیک دہم ص ۲۷۱ پر رقم طراز ہیں:۔

" یہ نہایت کارآمد، اور عام زبان ہے، جس پر ہندوستان
فخر کر سکتا ہے"۔

ایشیاٹک رسرچ کی ساتویں جلد میں ہے:۔

" یہ شستہ زبان، جو ہندوستان کے .... ہر حصے

میں بولی جاتی ہے، یا جو تعلیم یافتہ دیسیوں نیز ہندوستان کے بہت سے صوبوں کے ناخواندہ لوگوں میں باہمی گفتگو کا مشترک ذریعہ ہے، اور جسے تقریباً ہر جگہ، اور ہر گاؤں کے اکثر باشندے سمجھتے ہیں۔"

بیاناتِ مذکورہ سے ہمیں یہ تحقیق ہو جاتا ہے، کہ اردو میں نہ صرف قومی و ملکی زبان بننے کی صلاحیت ہے، بلکہ وہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے، یہ امتیاز حاصل کر چکی ہے، کہ وہ ہندوستان کی قومی زبان ہونے کی حیثیت سے اس سرے سے اس سرے تک، سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے، اور قومی و ملکی ضروریات کو بخوبی پورا کر رہی ہے۔

بولی جاتی ہے، سمجھی جاتی ہے، تصنیف و تالیف کی زبان ہے، ہر قسم کے علوم و فنون کے ذخائر کا سرچشمہ ہے، اور کمی کو پورا کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔

ان ہی اوصاف کی برکت ہے، کہ غیر ممالک میں بھی اس کی درس گاہیں موجود ہیں، وہاں سمجھی جاتی ہے، بالضرورت بولی بھی جاتی ہے، آس پاس کے ممالک کی السنہ سے ڈانڈا میںڈا ہے، رسم الخط ملتا جلتا ہے لغات و الفاظ کی کرنسی کی ادل بدل ہے، غیر ممالک کے مفکر اور مصنف اس کے متعلق علم حاصل کرنا، اس پر قلم اٹھانا، فخر سمجھ کر اس کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں۔

اختصار، سلاست، لطافت، ہمہ گیری، اور جامع العلوم ہونے

کے لحاظ سے ہندوستان کی کوئی زبان اس کی ہم پلہ نہیں، اس لیے یہ ماننا پڑتا ہے
کہ "صرف" اردو "ہی ہے، جو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ اور ہوسکتی ہے۔
لیکن پھر بھی ہمیں جدوجہد کی ضرورت ہے، کیوں کہ زمانہ سُرعت کے ساتھ
ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر زمانے کے ساتھ قدم نہ بڑھایا، تو قومی زبان کے
امتیاز کا تاج اس سے چھین لیا جائے گا، اور یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں
کیا کرنا چاہیے؟ اردو ادبیات کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس سوال
کا جواب خود بہ خود مل جائے گا۔ یہاں اتنا ہی بتانا تھا۔ اور وہ بتا دیا گیا
ہے کہ:۔

"صرف اُردو ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے"

ایک صدی پُرانا اُردو انشاء پرداز

مولوی امام بخش صہبائی

"متداول تذکروں میں صہبائی کے حالاتِ زندگی چھ سات سطر سے زیادہ نہیں البتہ تذکرہ گلستانِ سخن صابر میں اور کریم کے تذکرے میں ڈیڑھ دو صفحے ملتے ہیں اور یہ بھی تفصیل سے معرّا۔ لہٰذا یہ مختصر حالات، قدیم وجدید تذکروں اور بے شمار مختلف اقسام کی کتابوں کے مطالعہ کی مدد سے مرتب کیے گئے ہیں جو ایک صدی پرانے اردو انشاء پرداز کی زندگی پر ایک گونہ روشنی ڈالتے ہیں۔

مولوی امام بخش صہبائی دلّی کے رہنے والے اور چیلوں[1] کے کوچے میں

---

[1] دلّی کی میونسپلٹی کی طرف سے اس محلے کے سرے پر اب جو محلے کے نام کا بورڈ لگایا گیا ہے اس پر دو نام لکھے ہیں۔ کوچہ چیلان و چہل امیراں کہتے ہیں کہ یہاں مغلیہ سلاطین کے چالیس نامور امیر رہتے تھے جن کی چالیس اعلیٰ شان حویلیاں تھیں۔ ہوں گی مگر اب نشان بھی نہیں بعض کا خیال ہے کہ مغل بادشاہ پیر و مرشد اور ان کے امیر چیلے کہلاتے تھے۔ اس لیے یہ نام پڑا۔

رہتے تھے۔ مگر ان کا آبائی وطن تھانیسر[۵۱] تھا۔ ان کے والد شیخ فاروقی[۵۲] تھے، والدہ سیدانی اور حضرت پیرانِ پیر دست گیر کی اولاد سے تھیں۔

حلیہ[۵۳] درمیانہ قد کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ موہنہ پر چیچک کے داغ مہندی سے رنگی ہوئی سُرخ ڈاڑھی۔ پرانی وضع کا لباس۔ ایک بر کا سفید پاجامہ سفید انگرکھا۔ کشمیری کام کا جبّہ۔ سر پر چھوٹا سا سفید صافہ۔ دبلے پتلے اور لاغر اندام۔

خصائل صہبائی سلیم الطبع، وسیع المشرب، نیک کردار، سنجیدہ اور بامذاق ہونے کے ساتھ مشقت پسند اور محنتی بھی تھے۔ خلوص اور آشنا پرستی اس عہد کا تمغاے امتیاز تھا جس کا تصور بھی آج مشکل ہے۔ ہندو ہوں یا مسلمان ان کا سب سے میل جول تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ ہماری قوم کا ایک بہت بڑا آدمی (سر سید) ان کے خلوص و محبت کا بہت زیادہ مدّاح تھا۔

علم و فضل صہبائی اور علم و فضل ایک ذات کے دو نام سمجھنے چاہئیں۔ وہ فارسی کے زبردست عالم اور دیگر علوم و فنون، طب، معما،

---

۵۱ تذکرہ گلستان سخن ص۳۲۲ مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۷۱ھ۔ ۵۲ آثار الصنادید چوتھا باب ص۹۸ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۵ء بار دوم ۵۳ خطبات گارساں دتاسی ص۱۸۹ چھٹا خطبہ ۱۸۵۵ء مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۳۵ء "طبقات الشعرائے ہند" مولوی کریم الدین ص۴۱۳ مطبوعہ ۱۸۴۸ء دہلی کی آخری شمع ص۲۳ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۴۰ء ۵۴ حیاتِ جاوید دوسرا باب ص۴۱، ۴۲ دوسرا حصہ ص۳۴۲ مطبوعہ لطیفی پریس دہلی ۱۹۳۹ء و آثار الصنادید چوتھا باب ص۹۸

صرف و نحو، عروض و قافیہ، بیان و معانی وغیرہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ جس کسی نے ان کے متعلق کچھ لکھا ان کے فضل و کمال کا نہایت احترام سے اعتراف کیا ہی۔ ان کے ہم عصر مولوی کریم الدین لکھتے ہیں:۔

"فارسی میں بڑی زبردست قدرت رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کتب فارسی میں مثل ان کے کوئی ماہر نہیں............
تمام کتبِ فارسیہ پر عبور ہی۔"

(طبقات الشعرائے ہند صفحہ ۱۳۲ مطبوعہ ۱۸۴۸ء)

موسیو گارسان دتاسی لکھتے ہیں:۔

"امام بخش صہبائی دہلی کالج کے پروفیسر ہیں یہ فارسی کے بہت بڑے استاد مانے جاتے ہیں......."

(خطباتِ گارسان دتاسی صفحہ ۹۱ پانچواں خطبہ ۱۸۵۴ء)

سر سید لکھتے ہیں:۔

"کمالاتِ ظاہری اور جلائلِ باطنی اور حسنِ خلق اور حمائد اطوار میں پسندیدۂ خالق و مقبولِ خلائق ہیں......... ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گزرا ہی اور طرفہ یہ ہی کہ فنونِ متعارفہ سخن دری مثل تحقیقِ لغت و اصطلاحاتِ زبانِ دری اور تدقیق مقالاتِ کتابی اور تکمیلِ عروض و قافیہ و استکمالِ فنِ معما وغیرہ میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہی کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیئے۔"

(آثار الصنادید چوتھا باب صفحہ ۹۸)

ہسٹری آف اردو لٹریچر کے مترجم مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں :-

"صہبائی بہت روشن خیال اور اخلاقی جرات کے آدمی تھے۔ زبان فارسی میں ان کو کمال حاصل تھا اور اس زمانے میں جب کہ فارسی کا دور دورہ تھا ایک خاص عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے .... فن شعر میں استاد مشہور تھے۔ قلعے کے اکثر شاہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے ......" (تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۸ نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۹ء)

یہی مرزا محمد عسکری، شیفتہ کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"شیفتہ کی قابلیت کا نشو و نما علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جمگھٹے میں ہوا جس میں مولوی امام بخش صہبائی .... شریک تھے۔"

(تاریخ ادب اردو حصہ نظم صفحہ ۳۶۱ نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۹ء)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں :-

"مولوی امام بخش صہبائی ...... اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ ان کی بعض کتابیں اب تک پڑھی جاتی ہیں شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔" ... (مرحوم دلی کالج صفحہ ۱۴۹ مطبوعہ ۱۹۳۲ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی لکھتے ہیں :-

"مولانا صہبائی .... کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے ایسے جامع الکمالات آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں، ہزاروں شاگرد ہیں جو اکثر ریختہ کہتے ہیں اور یہ ان کو اصلاح دیتے ہیں مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔"

(دلی کی آخری شمع صفحہ ۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دلی ۱۹۴۰ء)

پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں:۔

"امام بخش صہبائی ..... فارسی کے بڑے عالم و محقق تھے فارسی کی بعض ادق کتبِ درسیہ ...... کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں ...."

(داستانِ تاریخ اردو صفحہ ۲ مطبوعہ آگرہ اخبار پریس ۱۹۴۱ء)

بہرحال عہدِ ماضی کے اہلِ قلم ہوں یا دیدِ حاضر کے صہبائی کے علم و فضل کے سب معترف اور مداح ہیں۔ صہبائی نے اپنے علم سے کام لیا اور اپنے وقت کو کارآمد بنایا اس لیے اگرچہ ان کا جسمِ خاکی مدت ہوئی فنا ہو چکا لیکن صہبائی زندۂ جاوید ہیں۔ اور جب تک اردو زبان رہے گی ان کا نام اور ان کے کارنامے زندہ رہیں گے بیشک ؎

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

تصنیفات

صہبائی نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان کے لیے علمی پختگی، ذہنِ رسا۔ جدتِ طبع اور مشقت ضروری ہے۔ ورنہ عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔

تصنیفات اردو میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی۔ ان میں سے بعض وقتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو مدتوں بلکہ شاید ہمیشہ قابلِ مطالعہ رہیں گی۔ جو کتابیں دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہیں اور جن کا ہمیں پتہ چل سکا ان کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ اگر کبھی یوم صہبائی منایا گیا...... تو

ان کے کلام پر تبصرہ اور ان کی کتابوں کی اہمیت و نوعیت سے مناسب بحث کی جائے گی۔

اُردو کتابیں

(۱) ترجمہ حدائق البلاغۃ۔ تصنیف ۱۸۴۲ء حجم ۱۲۰ صفحات ۲۰×۲۶/۸ سائز

(۲) انتخاب دواوین شعرائے مشہور زبان اردو کا " ۱۸۴۴ء " ۲۷۲ " " "

(۳) اردو صرف و نحو قواعد اردو " ۱۸۴۵ء " ۲۴۹ " " "

فارسی کتابیں

(۱) شرح سہ نثر ظہوری

(۲) شرح پنج رقعہ "

(۳) شرح مینا بازار

(۴) شرح حسن و عشق

(۵) شرح الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہار

(۶) شرح معما

(۷) شرح معمائے نصرائے ہمدانی

(۸) شرح معمائے جامی

(۹) فن معما

(۱۰) حل مقالات عبدالواسع

(۱۱) قول فیصل

(۱۲) گنجینۂ رموز

(۱۳) ریزۂ جواہر

(۱۴) فرہنگ ریزۂ جواہر

(۱۵) صرف و نحو فارسی

(۱۶) کافی (علم قافیہ)

(۱۷) وافی (" ")

(۱۸) کلیات صہبائی

(۱۹) تقریظات صہبائی

(۲۰) مناقشات سخن

۱؎ افسوس کہ یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور جو ذخیرہ اس مقصد کے لیے مہیا کیا تھا حوادث زمانہ کے ہاتوں تاراج ہو گیا (اخلاق)

اولاد صہبائی ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جو اولادِ معنوی اور صلبی[۵۱] دونوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اولاد بھی خدائے تعالیٰ نے قابل عنایت کی تھی۔ ان کے ایک صاحب زادے اچھے عالم اور روشن خیال فاضل تھے۔ صہبائی انھیں بہت چاہتے تھے۔ مولوی عبد[۵۲]الکریم ان کا نام اور سوز تخلص تھا۔ یہ بھی غدر ۱۸۵۷ء کی بھینٹ چڑھے[۵۳]۔

ان کی ایک صاحب زادی تھانیسر ہی میں رہتی یا جا رہی تھیں۔ صہبائی کے نواسے کا ایک خط جن کا نام محمد حمید الدین تھا۔ خواجہ حالی نے حیات[۵۴] جاوید میں نقل کیا ہے جو انھوں نے سرسید کو تھانیسر سے بھیجا تھا۔

احباب صہبائی کثیر الملاقات تھے اور شہر کے بارسوخ ہندو اور مسلمان ان کے دوست اور واقف کار تھے لیکن چوں کہ وہ اعلیٰ علمی شغف کے آدمی تھے۔ اس لیے نام آور اہلِ قلم ادبا اور شعرا ہی سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ان میں مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم محمد مومن خاں مومن، حکیم آغا جان عیش۔ مولوی مملوک علی۔ مولوی

۵۱ عبدالغفور نساخ نے سخن شعرا اور قطعۂ منتخب میں صہبائی کے کئی صاحبزادوں کا حال لکھا ہے یہ کتابیں اس مضمون کے تیار ہونے کے بعد دستیاب ہوئی تھیں اور پھر غارت ہو گئیں۔ ۵۲ گلستانِ سخن ص ۲۷۷ مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۷۲ھ ۵۳ دلی کی آخری بہار ص ۷۹ محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۷ء ۵۴ حیاتِ جاوید دوسرا حصہ ص ۴۵ (فٹ نوٹ) مطبوعہ لطیفی پریس دہلی ۱۹۳۹ء۔

کریم الدین (طبقات الشعرائے ہند) مرزا غالب اسد اللہ خاں، شیخ ابراہیم ذوق، شاہ نصیر، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور ڈاکٹر سپرنگر قابل ذکر ہیں ان کے ماسوا سر سید ان کے جگری دوست اور یارِ غار تھے۔ چناں چہ خواجہ حالی لکھتے ہیں :۔

"مولانا صہبائی سے ان کی دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔" (حیات جاوید دوسرا حصہ ص۲۸)

"سر سید کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کھٹے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" (حیات جاوید دوسرا باب ص۴۸)

غرض کہ صہبائی بہ ذاتِ خود مستثنےٰ لیاقت کے آدمی تھے اور ایسی ہی باعلم اور قابل سوسائٹی کے فردِ فرید تھے۔

شاگرد صہبائی کا زیادہ وقت علمی مشاغل، تعلیم و تدریس اور اشعار کے حک و اصلاح میں گزرتا تھا۔ ان کے شاگردوں میں قلعۂ معلیٰ کے شاہزادے بھی تھے، اہل شہر بھی تھے اور مرحوم دہلی کالج کے طلبہ بھی۔ ان میں سے شاہزادہ مرزا قادر بخش صابر، میر حسین تسکین[ا]

ا (فٹ نوٹ ص۱۵۹ پر دیکھیے)

محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب اور لالہ جگل کشور آرج خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

صہبائی پر مغربی اثرات

صہبائی کے تعلقات انگریزوں سے بھی تھے اور انگریزی داں لوگوں سے بھی۔ مسٹر بوترس ان کے مربّی اور ڈاکٹر سپرنگر ان کے دوست تھے اور وہ ایسی سوسائٹی سے متعلق تھے جس کے اراکین مشرقی و مغربی علوم و فنون سے اردو زبان کو علمی زبان بنانے میں مشغول تھے۔ اس لیے عجب نہیں کہ صہبائی نے بھی انگریزی میں دستگاہ حاصل کی ہو۔ کم ازکم وہ انگریزی مبادیات اور علامات سے آگاہ اور ان کو اردو میں رواج دینے کے حامی تھے۔ اُن کی قواعد اردو[۱] اس کی شاہد ہے۔ کہ ڈیش، کوما، قوسین استفہامیہ اور دعائیہ ...... علامات کو انھوں نے تائید و تصریح کے اصول کے تحت اردو میں کھپانے اور رواج دینے کی کوشش کی ہے۔

روزگار

صہبائی کے نام کوئی جاگیر تھی اور نہ کہیں سے وظیفہ وہ ہندو مسلمان شرفا اور امرار کے بچّوں کو پڑھاتے تھے۔ ہندوؤں میں

لہ بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۴ یہ ہے: صابر نے "گلستانِ سخن" اردو شعرا کا ایک تذکرہ لکھا ہے جس میں صہبائی کی کتابوں پر اجمالی تبصرہ ہے۔ عبارت آرائی زیادہ اور مفہوم کم ہے۔ کہتے ہیں کہ صہبائی ہی نے لکھ کر دیا تھا واللہ اعلم سنہ ۱۲۷۱ھ میں مطبع مرتضوی دہلی میں چھپا تھا

[۱] قواعد اردو صفحہ ۱ تا ۱۲ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ سن طبع درج نہیں۔ کتب خانہ نذیریہ دہلی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

گڑ والوں کے بچے جو دلی کے نام ور رئیس تھے اور کشمیری پنڈتوں کے بچے خصوصیت سے ان ہی کے زیر تعلیم و تربیت رہتے اور ابتدا میں یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ بعد ازاں دہلی کالج میں فارسی مدرس مقرر ہوئے۔ پہلے چالیس اور پھر پچاس روپے ماہانہ تنخواہ ملنے لگی۔ بابائے اُردو (ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب) ان کے تقرر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے ۱۸۴۲ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر بہادر مدرسے کے معائنہ کے لیے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ۔ دوسرے حکیم مومن خاں تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے انھوں نے تو انکار کر دیا مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی بعد میں پچاس ہو گئے۔"

(مرحوم دہلی کالج صہ ۱۴۹ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳ء)

مرحوم دہلی کالج ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا۔ پہلے یہ کالج اسی عمارت میں تھا جہاں اب اردو کالج دہلی اور عربک کالج ہے۔ یہ عمارت اجمیری دروازے دہلی کے پاس واقع ہے اور تقریباً اسی عمارت میں

(فٹ نوٹ صہ ۱۴۷ پر ملاحظہ کیجیے)

۱۸۴۱ء تک رہا۔ بعد ازاں کشمیری دروازے کی اس عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں اب دہلی گورنمنٹ پولی ٹیکنک ہے۔[۲] غدر ۱۸۵۷ء میں لوٹ لیا گیا۔ انگریزی کتابیں پرزے پرزے اور سائنس کے آلات چورا چورا کر دیئے گئے۔ عربی فارسی کی قلمی کتابوں کے گٹھڑ کباڑیوں کے ہاتھ لگے۔ اور دعائیں کسیروں کے بھینٹ چڑھیں اور اس طرح یہ کالج تباہ و برباد ہو گیا۔

اس کالج کا طرز تعلیم وہی تھا جس کی طرف ہماری یونی ورسٹیاں اتنی مدت کے بعد اب عود کرنے لگی ہیں۔ یہ کالج رہتا تو ملک کو بڑا فائدہ پہنچتا۔ اس تھوڑی سی مدت میں جتنا کام ہوا یادگار زمانہ ہے۔ ماسٹر رام چندر پیارے لال آشوب، رائے صاحب لالہ کیدار ناتھ (بانی رام جس کالج دہلی) ماسٹر کیدار ناتھ، پیرزادہ محمد حسین، مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی کریم الدین (پانی پتی) اور پنڈت موتی لال اسی درس گاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے جن کے علمی کارنامے کالج کی کارگزاری پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔

کالج کے شعبۂ تصنیف و اشاعت سے بھی متعدد مفید و کارآمد

---

[۱] دہلی کے فرقہ وارانہ فساد ۱۹۴۷ء میں ستم پیشہ ظالموں نے دونوں درس گاہوں کا کتب خانہ برباد کر دیا اور دونوں درس گاہیں بند ہو گئی تھیں۔ البتہ عربک کالج ۲۶ جولائی ۱۹۴۸ء سے از سر نو دہلی کالج کے نام سے شروع ہو گیا ہے (انجام دہلی ۲۵ جولائی ۱۹۴۸ء)

[۲] اس عمارت پر ایک کتبہ نصب ہے جس میں لکھا ہے یہ عمارت دارا شکوہ کی لائبریری کی ہے۔

کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرکے شائع کی گئیں جو آج بھی قابلِ قدر ہیں۔

غدر کے بعد ۱۸۶۴ء میں دوبارہ جاری کیا گیا مگر پہلی سی بات پیدا نہ ہوئی اور ۱۸۷۷ء میں سیاسی مصلحت سے بند کر دیا گیا۔ اس کالج کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان تھی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے مرحوم دہلی کالج ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں اس کالج کے مفصل حالات تحریر کیے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ اہلِ غرض کارآمد چیزوں کو کس طرح مٹا دیتے ہیں۔

عُمر ڈاکٹر سپرنگر نے جو صہبائی سے واقف تھے ۱۸۵۴ء میں ان کی عمر اندازاً ساٹھ سال بتائی ہے۔ اس حساب سے سن پیدائش ۱۷۹۵ء ہونا چاہیے۔

مگر مولوی کریم الدین (طبقات[۲] الشعرائے ہند) جو صہبائی کے دوست بلکہ ہم پیشہ و ہم مشرب تھے اور ان سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے ۱۸۴۸ء میں اندازاً چالیس سال بتائی ہے اس اعتبار سے سن پیدائش ۱۸۰۸ء ہونا چاہیے۔

مولوی کریم الدین ہندوستانی تھے۔ اس لیے ان ہی کا تخمینہ ہمارے نزدیک قرینِ قیاس اور قابلِ ترجیح ہے۔ بہرحال اتنا مان لینے میں مضائقہ نہیں کہ وہ ۱۷۹۵ء اور ۱۸۰۸ء کے درمیان کسی سن میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۷ء

۱؎ خطبات گارساں دتاسی ص۹۵ انجمن ترقی اردو ہند) دہلی ۱۹۳۵ء

۲؎ طبقات الشعرائے ہند ص۴۱۳ مطبوعہ ۱۸۴۸ء۔

میں انھیں بے گناہ گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس حساب سے انھوں نے تقریباً پچاس اور زیادہ سے زیادہ ساٹھ یا سٹھ برس کی عمر پائی اس مدت میں غریبی اور مشکلات کے باوجود وہ کام کیے کہ آج تک بھلائی اور نیکی سے یاد کیے جاتے ہیں اور قابلِ عمل زندگی کا ایسا نمونہ چھوڑ گئے جس سے سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خاتمہ بالخیر صہبائی زبردست اخلاقی جرات کے مالک تھے قلعہ معلی کے شاہزادوں سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ ان کے خلاف بھی جاسوسی کی گئی مخبروں نے انگریز سرکار کے کان بھرے اور انجام کار یہ بھی دار و گیر کی لپیٹ میں آ گئے۔ عدالت نہیں انصاف نہیں۔ صفائی ہو تو کیسے گرفتار ہوئے قید کیے گئے۔ دریا کے کنارے لائے گئے۔ دوسرے قیدیوں کے ساتھ قطار میں کھڑے کیے گئے۔ اور گولیوں کی باڑھ مار دی گئی۔ شہیدوں کی روحیں اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئیں۔ ان ہی میں صہبائی کی روح بھی تھی۔ ظالموں نے صہبائی کے گھر کو بھی کھود کر بے نشان کر دیا۔

اس المناک واقعہ کی تفصیل مصورِ غم (علامہ راشد الخیری) نے میر قادر علی مرحوم سے نقل کی ہے۔ جو صہبائی کے بھانجے اور ان ہی بے جرم و بے گناہ قیدیوں میں تھے اور موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے تھے اور جان بچائی تھی۔ حصول عبرت کے لیے ان کا بیان بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے:۔

کارزارِ حیات[له]

"مولانا قادر علی صاحب مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے۔

له دلی کی آخری بہار صفحہ ۹۷ محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۷ء۔

اور ان ہی کے ساتھ ان ہی کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک موقع پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آ پہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دی تھیں اس لیے ہم گرفتار ہو کر دریا کے کنارے پر لائے گئے ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا اور پھانسیوں کے بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں ہم تیس چالیس آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ "موت تمھارے سر پر ہے۔ گولیاں تمھارے سامنے ہیں اور دریا تمھاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں"۔ میں بہت اچھا تیراک تھا، مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے اس لیے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لیے میں دریا میں کود پڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھتا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آواز میرے کان میں آئی اور صف بستہ گر کر مر گئے"۔

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۱ پر دیکھیے)

اگرچہ وہ بڑی ہل چل کا زمانہ تھا اور سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی تاہم جو زندہ تھے انھیں صہبائی کے مارے جانے کا بڑا ملال تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے کس آزردگی سے کہا ہے کہ کلیجہ موٗنھ کو آتا ہے۔ حالانکہ وہ خود معتکف اور گوشہ نشین تھے ؎

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

سرسید کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا ذکر ہی کیا انھوں نے صہبائی کے بے قصور ہونے کی اپیل کی ثبوت بہم پہنچائے اور جب اُن کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو صہبائی کی بیوہ اور پس ماندگان کا وظیفہ انگریزی سرکار سے مقرر کرا دیا اور اس طرح حق دوستی ادا کیا۔

صہبائی کا ایک شعر ہے اور ان ناشدنی واقعات کی جھلک اس

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۰ یہ ہے)

لہ نورالحسن خاں کلیم کا لکھا ہوا فارسی شعرا کا تذکرہ طور کلیم جو نایاب کتابوں میں سے ہے۔ اس مضمون کی اولین طبع کے بعد مجھے دستیاب ہوگیا تھا لیکن اب پھر وہ فسادات دہلی ستمبر ۱۹۴۷ء کی بھینٹ چڑھ گیا۔ انھوں نے صہبائی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھیں پھانسی دی گئی تھی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کس کا بیان صحیح ہے۔

لہ یہ غیر ملکی حکومت کا چلن تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ملکی حکومت ہندوستانیوں کے منقولہ و غیر منقولہ نقصانات کی کیا تلافی کرتی ہے؟ جو فسادات ستمبر ۱۹۴۷ء میں وقوع پذیر ہوئے۔ (الحمدللہ میری جائداد واگزار ہو چکی ہے جو پہاڑ گنج وغیرہ میں ہے۔ اخلاق)

میں بھی پائی جاتی ہے۔ دیکھنا کس درد مندی سے کہا ہے ؎

مُردم و در چشم مُردم عالمے تاریک گشت
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

خواجہ حالی کے بیان سے اس کی تائید مزید ہوتی ہے کہ صہبائی کے بعد فضلائے دہلی کی محفل درہم برہم ہوگئی اور مدتوں اس کا ماتم رہا اس کے متعلق خواجہ حالی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا۔ کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

بہرحال صہبائی ہماری زبان کے ایک صدی پرانے ادیب اور اچھے

انشا پرداز تھے اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو ان کے علم و فضل اور ان کے قلم سے اُردو زبان کی ترقی و توسیع میں اضافہ ہوتا۔ ان کی بے ہنگام موت سے ہماری زبان کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا جو قابلِ افسوس ہے۔ اِن کی علمی ادبی جذبات کا اعتراف اب اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ ان کی اردو تصنیفات کو جو نایاب ہو چکی ہیں از سرِ نو شائع کیا جائے اور ان کی اہمیت و حقیقت پر روشنی ڈالی جائے تاکہ باقیات الصالحات کا یہ ذخیرہ محفوظ رہے اور ان کے مطالعہ سے آیندہ نسلوں میں بقائے دوام کا شوق اور کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو ؂

ادب اور زندگی

زندگی اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندگی بدلتی ہے تو ادبی مذاق بھی بدلتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ادب[1] اپنے زمانے کا عکس ہے۔ ادب[2] اپنے زمانے کا آئینہ ہے۔ ادب[3] اپنے زمانے کا مرقع ہے۔ ادب[4] حقیقت کا اظہار ہے۔ ادب[5] ایک عہد اور ایک روایت ہے۔ ادب[6] اپنے زمانے کی تاریخ ہے۔ ادب[7] اپنے زمانے کی معاشرت اور اپنے زمانے کے تمدن کا علم بردار ہے۔ ادب[8] زندگی کا ترجمان ہے۔ ادب[9] ساتھی ہے ماحول کے تقاضوں کا۔ ادب[10] اپنے مصنف کے رجحانات کا پرتو ہے۔ ادب[11] نفسیاتی سوانح حیات ہے اپنے مصنف کی۔ ادب[12] زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔ ادب[13] زندگی کے تجربوں کا بیان ہے۔ ادب[14] تنقید حیات ہے۔ ادب[15] تحریص عمل ہے اور یہ سب ہی کچھ اس پر صادق آتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ادب زندگی ہے اور زندگی ادب۔

اس اعتبار سے ایک ادیب اور ایک شاعر اپنے عہد کا ترجمان بلکہ بذاتِ خود ایک عہد اور ایک روایت ہے وہ عکاس ہے اپنے ماحول کے اثرات کا۔ الغرض وہ انسانیت کا۔ علویت کا۔ شرافت کا وارث ہے اور علم بردار ہے۔ وہ خود متاثر ہوتا اور دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ وہ خطیب ہے مگر خطابت سے کام نہیں لیتا ہے۔ وہ ماہر جراح کی طرح باتوں ہی باتوں میں نشتر چبھوتا اور

کام نکال لیتا ہی مولانا رُوم نے کیا خوب کہا ہی ؎

خوش تر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ادب کیا ہی؟ زندگی کے وہی تجربات اور وہی تاثرات ہیں جن سے ہمیں دوچار ہونا پڑتا ہے وہی تخیّل کا چولہ پہن کر ادب کا روپ لیتے ہیں۔ اسی لیے ادیب وشاعر میں جذبات کی جتنی شدتِ احساس ہوتی ہی اتنا ہی اس کا کلام کارگر نشتر ہوتا ہی اور اتنا ہی بلند اور دل کش ہوتا ہی۔

چناں چہ غرض وغایت یا مقصد کے اعتبار سے ادب کی دو کامل قسمیں سمجھی جانے لگی ہیں۔ ایک ادب برائے ادب اور دوسرے ادب برائے زندگی

ادب برائے ادب سے مراد ہی وہ ادب جو صرف دل بہلانے یا وقت گزارنے اور جذبۂ حیرت کی تسکین دینے کے لیے تخلیق کیا جاتا ہی۔ اسی لیے یہ ضرب المثل ہی کہ قصّہ قصہ ہی اور زندگی زندگی۔ مگر اس کے برعکس ادب برائے زندگی سے مراد وہ ادب ہی جس میں زندگی کی قدریں شامل ہوں جو زندگی کا سدھار اور مسائلِ زندگی کا حل پیش کرے۔ جو جذبات وخیالات میں قوت وحرکت پیدا کرے۔ جو جذبۂ حُسن اور صحیح ذوق کو بیدار کرے۔ جو ذہنی اور روحانی تسکین بخشے۔ جو سچّا ارادہ اور مشکلات پر قابو پانے والی صلاحیّت اور استقلال کو بروئے کار لائے اور یہی دراصل سچّا اور حقیقی ادب کہلانے کا مستحق ہی۔

ادب کیسا ہی ہو، برائے ادب ہو یا برائے زندگی۔ حقیقت یہ ہی کہ

کوئی ادب اور کسی قسم کا ادب اپنے زمانۂ تخلیق کے اثرات وحالات اور ادیب یا شاعر کے فطری رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ البتہ ادب برائے ادب میں یہ اجزا بلا ارادہ اور غیر شعوری طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ادب برائے زندگی میں ان اجزا کا شمول شاعر یا ادیب کا اولین مقصد ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ بلا ارادہ ان اجزا کا شمول زیادہ مفید اور زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ قصے کہانیوں کی مقبولیت اور ان کے نتائج جو تہذیب نفس کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اس کی روشن دلیل ہے۔ اسی لیے تو پریم چند[1] کو کہنا پڑا:-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرتِ انسانی کا ماہر شہزادوں کے حُسن وعشق اور طلسماتی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کر سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ گل وبلبل کی داستان بھی اس کے لیے موزوں ثابت ہو سکتی ہے۔"

بہرکیف اس تمہید سے یہ حقیقت روشن ہے کہ ادب میں زمانۂ تخلیق اور ماحول کے اثرات ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں بلکہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے زمانے کی نفسیاتی اور معاشرتی تاریخ بہ خوبی مرتب کی جا سکتی ہے اور یہی مفید بھی ہوتی ہے کیوں کہ تاریخ کی وہ کتابیں جن میں سطحی اور غیر دلکش واقعات کو سلسلہ وار بیان کیا جاتا ہے۔ وہ واقعات و حادثات کی کھتونیاں تو بیشک ہیں لیکن صحیح معنوں میں تاریخ نہیں۔ ان کا

---

[1] پریم چند ص۲۸۱ خطبۂ صدارت۔

مطالعہ بارِ خاطر اور ذہنی کوفت اور دماغی انتشار کا باعث تو ہوتا ہے۔ مگر انسانی سیرت کے لیے مفید نہیں۔ اس سے سیرت میں نہ تو کوئی پختگی آتی ہے اور نہ کوئی سدھار ہی پیدا ہوتا ہے جو تاریخی مطالعہ کا منشا اور حقیقی مدعا ہے۔

ادب سے نہ صرف یہی فائدہ ہے کہ ہم کسی زمانے کی سیدھی سچی تاریخ مدوّن کر سکتے ہیں بلکہ اس سے ہم کسی ادیب یا شاعر جس کی وہ تخلیق ہے اس کے رجحانات و مرغوبات کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں اس کے تنزل اور ترقی کے اسباب و علل کو بھی بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں۔ گویا کہ ادبی نقوش سے ہمیں جو راہ نمائی ملی ہے اور مل سکتی ہے وہ واقعات کی کھتونیوں سے نہ کبھی ملی ہے اور نہ مل سکتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ادب کا مطالعہ ہمارے لیے اور ہماری سیرت کے لیے ہر طرح مفید ہے اور اسی میں ہماری مشکلات کا حل ہے بشرطیکہ ہم صحیح نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں۔ لہٰذا اسی کے پیشِ نظر اب ہم اپنے ادب کا سرسری مطالعہ کرتے اور ہلکا سا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کہاں تک یہ نظریہ حق بجانب ہے جو سطور بالا میں قلم بند ہوا ہے۔

ہمیں علم ہے کہ وَلی اورنگ آبادی اردو غزل گوئی کا بابا آدم ہے اس کے دم سے باقاعدہ اردو غزل کا چراغ روشن ہوا۔ غزل گوئی کا چرچا پھیلا۔ اور اسے قبولیت نصیب ہوئی۔ حتیٰ کہ دوسرے بھی اسی ڈگر پہ چل نکلے۔ پھر تو وہ بہار آئی کہ اردو ادب، اردو ادب ہو گیا۔ اور ایسے صاحب کمال عالم وجود میں آئے کہ جن کا نام دکام رہتی دنیا تک رہے گا۔

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ   اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

ولی عہدِ اورنگ زیب ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں پیدا ہوئے اور عہدِ محمد شاہ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں انھوں نے وفات پائی۔ یہ زمانہ عیش و فراغت کے باوجود نہایت افراتفری کا زمانہ ہے۔ پیہم جنگ و پیکار سے طبیعتیں اکتا چکی ہیں۔ زوال کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ رفتہ رفتہ کاہلی اور بے عملی کے قدم جمتے چلے ہیں۔ بے ہمتی اور بے جمعیتی نے استقلال و پامردی کا چولہ پہنا اور بہروپ بھرا ہے۔ لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کی گرم بازاری ہے مگر جڑا بھی مضبوط ہے ع

ہرچہ آید بر سرِ اولادِ آدم بگزرد

جو پڑتی ہے انگیز لی جاتی ہے۔ آج نوحۂ ماتم ہے تو کل نغمۂ شادی۔ ان حالات سے تصوف کا ذوق طبیعتوں میں رچنے لگا ہے۔ سادگی و صفائی بھی ہے اور آرائش و زیبائش بھی اور یہ سب کچھ مجموعی طور پر ولی کی شاعری میں موجود ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ ولی کی شاعری کا خمیر ہی ان حالات سے تیار ہوا ہے۔ وہ منھ سے پڑی بول رہی ہے کہ وہ اس عہد کی یادگار ہے جب عروج و زوال کی سرحدیں باہم ترکیب پا رہی تھیں۔

ولی کی شاعری سے ولی کے ذاتی رجحانات اور طبعی مرغوبات کا بھی اندازہ ہوتا ہے مثلاً ان کے کلام کی سادگی و صفائی ان کی مزاج کی سادگی اور نکوکاری کی دلیل ہے۔ ہندی و فارسی الفاظ کی پیوندکاری اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہونا ان کی سلیقہ مندی ان کے ادبی ذوق اور قوتِ ایجاد و اختراع پر دلالت کرتی ہے تصوف کی آمیزش روحانی ارتقا اور حادثاتِ زمانہ کا پتہ دیتی ہے۔

الغرض ان کا عمل اور ان کی کارگزاری ہر پہلو سے ان کے عہد کی جیتی جاگتی

تصویر ہے گویا کہ روح عصر اس میں حلول کر آئی ہے۔ اور ان کی شاعری کو ماضی وحال بلکہ مستقبل کا آئینہ بنا دیا ہے۔ ان کا رنگ یہ ہے ؎

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
ایک نگہ میں تمام کرتے ہیں

تجھ مکھ کی جھلک دیکھ گئی جوت چندر سوں
تجھ مکھ پہ عرق دیکھ گئی آب گوہر سوں

عشق میں جنبہ رضا درکار ہے
فکر اسباب وفا درکار ہے

سیر دریائے معرفت کوں سنوار
کشتیٔ دل اگر قلندر ہے

اے ولی صاحب سخن کی زباں
بزم معنیٰ کی شمع روشن ہے

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

گنگار وال کیا ہوں اس کے نین سے متی
آ۔ اے صنم شتاب ہے روز نہان آج

البتہ گل پیادہ ہوں دوڑیں رکاب میں
اس نو بہارِ حسن کی دکھیں جو شان آج

ہے حسن کے ملک میں سجن تجھ کوں راج آج
خوش دل بری کا تجھ کوں ملا تخت و تاج آج

ولی تجھ طبع کے گلشن میں جو کوئی سیر کرتے ہیں
وہ تحفہ کرلے جاتے ہیں گلِ اشعار ہر جانب

صحبتِ غیر موں جایا نہ کرو
دردمنداں کو کڑھایا نہ کرو

حق پرستی کا اگر دعویٰ ہے
بے گناہاں کوں ستایا نہ کرو

پاک بازاں میں ہے مشہور ولی
اس سوں چہرے کوں چھپایا نہ کرو

یہ ہی وَلی کے کلام کا نمونہ۔ جو وَلی کے ذوق کی بھی غمازی کرتا ہی اور حالاتِ زمانہ کی نشان دہی کرتا ہی جس کا صاف یہ مطلب ہی کہ ادب اپنے زمانے کا عکس بھی ہوتا ہی اور مصنف کے رجحانات کا آئینہ بھی۔

مِیر و سَودا کا زمانہ اردو شاعری کا زرّین عہد کہا جاتا ہی۔ یہ سخت ابتلا کا زمانہ ہی۔ ادبار کی بدلیاں امنڈ امنڈ کر آتیں اور قیامت کی موسلا دھار بارش ہوتی ہی سہمے سہمے دل۔ اترے اترے سے چہرے۔ روکھی سی آنکھیں۔ اوسان باختہ۔ بے حواسی چھائی ہوئی۔ جڑیں کھوکھلی۔ عزت آبرو خطرے میں۔ بیکاری کی گرم بازاری۔ کوئی آسرا نہیں۔ وسیلہ نہیں۔ امیروں کی حالت غریبوں سے بدتر اپنے کو دھوکہ میں ڈالا ہی کہ آبرو سنبھالے بیٹھے ہیں۔ عیش و عیاشی کی بدولت عمل کی قوت جواب دے چکی ہی۔ حوصلہ رہا ہی نہ ہمت۔ مگر خو خصلت وہی ہی ارمان اور چونچلے وہی ہیں۔

بزرگوں کا اندوختہ کیسا گھر چن بھی نبڑ چکی ہی۔ عقل دور اندیش کہاں؟ فکرِ مآل کدھر؟ ٹونے ٹوٹکے چلتے ہیں۔ اُپری دعائیں ردِّ بلیات کا تدارک ہی۔ انجام کار ابدالی کی پیہم یورش نے اور نادر کے سفاکانہ قتل و غارت نے چولیں ہلا دیں اور شیرازہ بکھیر دیا۔ مرہٹی گھسگھس جونک بنی خون چوسے چلی جاتی ہی بس اب اللہ ہی اللہ ہی۔ جھوٹی سچی جیسی بھی ہی بس اللہ ہی سے لو لگی ہی البتہ تہذیبِ قدیم ایک لاش ہی بے گور و کفن ایک ڈھانچہ ہی بے روح اور بے جان یہی ایک مورتی ہی جس پر سب فدا ہیں۔ جی جان سے قربان ہیں اور اسی کی پوجا کرتے ہیں۔

یہ حالات تھے جن میں میر سودا خواجہ درد۔ اور میر حسن کی شاعری نے پرورش پائی اور پروان چڑھی۔ میر ان اندوہناک حالات کی تاب نہ لا سکے۔ روتے ہیں اور رلاتے ہیں۔ تڑپتے ہیں اور تڑپاتے ہیں۔ دل کے مرثیے لکھتے ہیں اور نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ سب ایک ہی منجدھار میں ہیں اس لیے سب ہی شریک اور ہم نوا ہیں۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے / درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان ہوا
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو / شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا / دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی / چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
ہائے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو / ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات / کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
سر سری تم جہان سے گزرے / ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے / دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
میرے سلیقے سے مری نبھی محبت میں / تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا / دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا / پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا
جہاں سے دیکھیے یک شعر شور انگیز نکلے ہے / قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میر کے دیواں میں

میر صاحب نے جو کچھ کہا۔ بجا کہا۔ درست کہا۔ یہ سب کچھ ان ہی کی روداد اور ان ہی کی سوانح حیات ہے۔ یہ ان کے مزاج کی افتاد اور طبیعت کا اقتضا ہے۔ وہ

حساس اور سب سے زیادہ حساس طبیعت رکھتے تھے۔ غم ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اس لیے جو غم والم کے نشتر میرؔ کے ہاں ملتے ہیں وہ کہیں نہیں ملتے۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب لکھتے ہیں[۱] :-

"ذکرِ میرؔ، پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا ہر شعر ان کے دردِ دل کی تصویر ہے۔"

ورنہ ان ہی حالات سے سوداؔ کو بھی دوچار ہونا پڑا۔ مگر وہ ہشاش بشاش طبیعت کے مالک اور باغ و بہار مزاج کے آدمی تھے۔ وہ ہنستے ہیں اور ہنساتے ہیں مصائب کی موسلا دھار بارش سے شرابور ہو جاتے ہیں مگر ٹھٹھے مارتے اور قہقہے لگاتے ہیں ؏ مرگِ انبوہ جشنے دارد کی مصداق سب ہی ایک حمام میں ننگے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ وہیں پھاگ کھیلتے۔ پھکڑ بازی کرتے۔ فقرے کستے پھبتیٔ اڑاتے اور دل بہلاتے ہیں۔ وہ زندگی کے چند لمحے بسور بسور کر نہیں ہنس بول کر گزار دینا چاہتے ہیں اور جیسا چاہا انھوں نے ویسے ہی وہ گزار گئے۔

سپاہیوں کی بدحالی۔ امیروں کی بداطواری۔ مہاجنوں کی ستم کاری سب ہی پر ضربیں لگائیں اور ایسی کاری لگائیں جو تا قیام قیامت برقرار رہیں گی۔ اور ان کی اور ان کے عہد کی بدحالی کی روداد سناتی رہیں گی۔ یہی ان کا کارنامہ ہے جس کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہے۔ ہلکا سا رنگ روپ سوداؔ کا یہ ہے سے

---

[۱] انتخاب کلام میر مقدمہ ص ۱۴

امیر اب جو ہیں دانا انھوں کی ہے یہ چال — ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بچھی ہے سوزنی۔ خوجہ کھڑے جھلے ہے رومال — حضور بیٹھے ہیں ایک دو ندیم اہلِ کمال
دھرے ہے روبرو اک پیکدان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو ان کے۔ انھوں کے گھر آیا — ملے یہ اس سے۔ گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا — انھوں نے پھیر کے ادھر سے موںھ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لیے جمع ہوں صغیر و کبیر — تو ملک و مال کا فکر اس طرح کرے ہیں مشیر
وطن پہنچنے کی سوجھی ہے بخشی کو تدبیر — کھڑا یہ اٹکلے دیوانِ خاص بیچ وزیر
کہ شامیانے کے بانسوں میں نقرئی ہیں جھول

غرض میں کیا کہوں یارو۔ کہ دیکھ کر یہ قہر — کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردشِ دہر — تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردمِ شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

اس موضوع سے متعلق سودا کی کامیاب نظمیں وہ ہیں جو کمین۔ ندرت۔ فدوی۔ ساجد۔ اور میر ضاحک کی شان میں ہیں اور جو ان کے کلیات کی زینت ہیں۔ یہاں انھیں نقل کرنے کا محل نہیں۔ لہذا اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اسی سے ان کے مزاج اور ان کے احول کا بہ خوبی انداز ہو جاتا ہے۔

درد خود سراپا درد اور اسم بامسمیٰ ہیں۔ لفظ درد۔ خود درد کے مزاج اور حالاتِ زمانہ کا ترجمان ہے۔ مگر درد کی غیر معمولی سنجیدگی نے۔ ان کے توکل نے۔ ان کی قناعت نے تصوف و للہیت کے روپ میں جلوہ دکھایا اور اسی وصف نے

ان کا پایہ بلند کیا اور ان کے کلام کو پایہ داری بخشی اور امنٹ بنا دیا ہے۔ حالات وہی ہیں، جن سے سوداؔ و میرؔ کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ مگر انھوں نے اذیت مصیبت اور بلا کو ایک بھٹی تصور کیا۔ جس میں پڑ کر زنگ دور ہوتا اور سونا کندن بنتا اور نکھار لاتا ہے۔ لہٰذا وہ سدھار کا پیغام دیتے اور تصوف کی نے میں مجاز کے پردے اٹھاتے اور حقیقت سے روشناس کراتے ہیں۔ اس وصف میں ان سے کوئی لگا نہیں کھاتا۔ ان کا کلام اخلاقی اصلاح سے شروع ہوتا اور دوئی کے پردے اُٹھا کر حقیقت سے جا ملاتا ہے۔ وہ اس مقام کی راہ نمائی کرتے ہیں۔ جہاں کسی چیز کی محتاجی نہیں رہتی۔ ان کا کلام جتنا اعلیٰ و ارفع ہے۔ اتنا ہی ان کا اسلوب پاکیزہ اور ان کی ذات گرامی بلند و بالا ہے۔ وہ یکسر زمانے روزگار اور اپنے ماحول سے بہت آگے ہیں۔ اور مستقبل کے لیے نشانِ راہ ہیں۔ ان کا کلام ماضی و حال بلکہ مستقبل کا آئینہ ہے اور کیا خوب ہے ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب۔ کوئی پردہ نہ دیکھا

پھولے گی اس زباں میں گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

آیا نہ اعتدال پر ہرگز مزاجِ دہر
میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل
گل کو شگفتہ دل کہو تم۔ یا شکستہ دل

تھا عالمِ جبر کیا بتاویں
کس طور سے زیست کر گئے ہم

اگر جمعیتِ دل ہے تجھے منظور قانع ہو
کہ اہلِ حرص کے کب کام خاطر خواہ ہوتے ہیں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو	دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر	سانپ کی زیست ہے تجھے سُم ہے
تمنّا ہے یہ تری - اگر ہے تمنّا	تری آرزو ہے - اگر آرزو ہے
کیا سیر ہم نے گلِ زار دنیا	گل دوستی ہیں عجب رنگ و بُو ہے
اکسیر پر مہوس اتنا نہ ناز کرنا	بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا
میں اپنا دردِ دل چاہا کہوں جس پاس عالم ہیں	بیان کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

جو بھی عہدِ دردؔ کے حالات سے با خبر ہے۔ اس کے لیے اس انتخاب ہی میں سب کچھ ہے گویا کہ کلیجہ چیر کر سامنے لا رکھا ہے۔ اور پھر اس خوبی سے کہ کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں۔ یہ ادب بھی ہے اور زندگی بھی۔ یہ شاعری بھی ہے۔ اور راہ نمائی بھی۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا۔

میر حسنؔ نے بھی اسی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ بچپن میں خواجہ دردؔ کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہے۔ سنجیدگی کے ساتھ شگفتہ مزاجی بھی ورثے میں ملی ہے وہ شائستگی اور تہذیب کی تصویر ہیں۔ نہ میرؔ کی طرح روتے ہیں نہ سوداؔ کی طرح قہقہے لگاتے ہیں۔ نہ دردؔ کا سا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ مگر پہلو میں حسّاس دل ہے جو کچھ دیکھتے ہیں جوں کا توں مگر سلیقے کے ساتھ قلم کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کا کلام ان کی میانہ روی کا ترجمان ہے۔ ان کی مثنویاں اس عہد کے رسم و رواج کا آئینہ ہیں بلکہ وہ تاریخ ہیں عظمتِ ماضیہ کی اور ترجمان ہیں۔ احوالِ زمانہ کی۔ ان کا بھی کیا خوب رنگ ہے ؎

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان	لگے جس میں زربفت کے سائباں

چمکیں اور پردے بندھے زرنگار دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
بدن آئینہ سا دمکتا ہوا گلِ باغِ خوبی لہکتا ہوا
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام قیامت کرے جس کو جھک کر سلام
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے محبت میں دن رات گھٹنا اسے
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی، کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
نہ سدھ بدھ کی لی نہ منگل کی لی نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

وہ جب تک کہ زلفیں سنورا کیا کھڑا اس پہ میں جان وار کیا
قمارِ محبت میں بازی سارا وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا

یہ ہے میر حسن کا کلام۔ اندازِ بیان اگرچہ ہلکا پھلکا اور شایستہ ہے مگر اثر بجلی کی طرح دوڑ جاتا ہے اور ہو بہو نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ جذبات ہوں یا محاکات۔ موتی کی طرح ڈھلتے چلے آتے ہیں۔ اس میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ اور کس خوبی سے ہے کہ دل مزے لینے لگتا ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حالاتِ زمانہ وہی ہیں۔ معیارِ شرافت وہی ہے۔ مگر اختلافِ مزاج کا یہ کرشمہ ہے کہ اسلوب و انداز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

گویا کہ مادہ ایک ہے مگر سانچے الگ الگ ہیں۔ اور اسی بہروپ میں ادب اپنا روپ دکھا رہا ہے کہ وہ حالاتِ زمانہ کا بھی ترجمان ہے۔ اور شاعر کے جذبات واحساسات کا بھی۔ اور یہی اس کا منصب ہے۔

یہ ہلکا سا تبصرہ شعر و شاعری سے متعلق ہے۔ اب ذرا اپنی نثر پر بھی سرسری سی نظر ڈال لینا بے محل نہ ہوگا۔ خواجہ سید محمد گیسو درازؒ کی کتاب معراج العاشقین کو ابھی تک نثر اردو میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ خواجہ موصوف عہدِ خلجی سنہ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء دہلی میں پیدا ہوئے اور سنہ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء گلبرگہ (دکن) میں انھوں نے وفات پائی۔ اس عہد میں خسرو خاں کی بغاوت۔ تغلق خاندان کی بادشاہت کا قیام۔ محمد تغلق کا دیوگری کو پایہ تخت بنانا۔ اہلِ دہلی کو سنگینوں کے زور سے لے جانا۔ دلی کی تباہی۔ فیروز تغلق کی اصلاحات۔ امیر تیمور کی یورش اور دہلی کا قتلِ عام بے شمار حادثات تھے۔ جن کی بنا پر قدرتاً مذہبی رجحانات کا روبکار آنا فطری امر تھا۔ اسی لئے یہ دور مذہبی تصنیفات کا دور تصور کیا جاتا ہے۔ معراج العاشقین بھی مذہبی کتاب ہے جو اپنی نوعیت سے ان حادثات کی ترجمان ہے۔ اور پاکیزگی تخئیل سے اپنے مصنف کی سیرت پر روشنی ڈالتی ہے۔

اس کے بعد بڑی مدت تک نثر نگاری کی رفتار دھیمی رہی۔ اور جو کتابیں تصنیف ہوئیں وہ اسی نوعیت کی ہوئیں۔ البتہ کوئی چار سو برس بعد ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں میر امّن دہلوی نے باغ و بہار لکھی جسے حیاتِ جاوید نصیب ہوئی اور اگرچہ یہ ایک فارسی قصے کا آزاد ترجمہ ہے لیکن میر امّن کا کمال یہ ہے

کہ انھوں نے اسے وطنی معاشرت اور تمدن کے سانچے میں ڈھال دیا ہی۔ اب یہ اس عہد کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور عروج و زوال کی منھ بولتی تاریخ ہی۔ میر امّن کا عہد قریب قریب وہی ہی۔ جو میر و سودا اور میر حسن کا ہی۔ میر امّن کی یہ کتاب میر صاحب[۵] کی حیات میں تیار ہو چکی تھی۔ پھر میر امّن خود ایسے صاحبِ کمال ہیں کہ بقول سرسید جو مرتبہ میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہی وہی میر امّن کو نثر میں ہی۔" میر امّن کی باغ و بہار کے متعلق رام بابو سکسینہ[۶] لکھتے ہیں:-

"یہ قصہ نہ صرف دل چسپ ہی بلکہ اس میں اس زمانے کے رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کے مرقع نہایت خوبی سے کھینچے گئے ہیں۔"

گویا کہ یہ ایک زندہ مثال ہی اس حقیقت کی کہ ادب اپنے عہد کی تاریخ اور اپنے مصنف کی سیرت کا پرتو ہوتا ہی۔ اور مطالعہ سے یہ حقیقت زیادہ دل نشیں ہو جاتی ہی۔

اس کے بعد ایک قابلِ قدر تصنیف کا ذکر اور کیا جاتا ہی۔ جو قصے اور ناول کی درمیانی کڑی ہی۔ یہی وہ تصنیف ہی جس نے ناول نویسی کے شوق کو اُبھارا اور قصہ نویسی کے رُخ کو بدلا۔ یہ ہی "فسانۂ عجائب" جو میرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کی قلم کاری کا نتیجہ ہی۔ یہ اپنے اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش کے اعتبار سے عہدِ ماضی کی یادگار ہی۔ لیکن ادب زندگی

---

۵ میر صاحب نے ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ ۶ تاریخ ادب اُردو حصہ نثر ص

کے امتزاج کا آئینہ بھی ہے۔ اس کا سن تصنیف ہے ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۴ء اس کے متعلق مورخین ادب کی جو رائے ہے اسے رام بابو سکسینہ نے ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔[1] وہ لکھتے ہیں :۔

"اس میں اس زمانے کے شہر لکھنؤ کی سوسائٹی۔ وہاں کے طرزِ معاشرت امرا و رؤسا کی وضع داریوں۔ ان کے پر تکلف جلسوں شہر کے رسوم و رواج۔ کھیل تماشوں۔ دل چسپ مناظر مختلف پیشوں اور اہلِ کمال کے حالات۔ بازاروں کی چہل پہل سودا فروشوں کی آوازوں .... کی دل کش اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔"

یہ تبصرہ نہایت جامع ہے اور اس سے یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب جو بظاہر ایک افسانہ ہے اور عقل سے بعید تر بلکہ فطرتِ انسانی سے بالاتر باتیں بھی اس کا جزوِ اعظم ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ دراصل اپنے عہد کی مونھ بولتی تاریخ ہے جو اپنے مصنف کے طبعی رجحانات کا عکس اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

الغرض یہ اردو ادب پر ایک سرسری اور اچٹتا ہوا سا تبصرہ ہے جس میں بہت کچھ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مثلاً مرثیہ کی صنف کو چھوا تک نہیں جو دراصل تہذیب و معاشرت کا مخزن ہے۔ اس کے علاوہ نظیر اکبرآبادی

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۲۵،۲۴۔

کی نظمیں جو تہواروں اور میلے ٹھیلوں کے چشم دید حالات کا عکس ہیں۔ اور انشاؔ و مصحفیؔ جن کا کلام اس عہد کی زوال پذیر سوسائٹی کا مرقع ہے۔ اور غالبؔ و ذوقؔ اور آبرو و داغؔ۔ جنھوں نے ایک عظیم انقلاب دیکھا اور اس کی عکاسی کی۔ ان میں سے کسی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔

نثر میں بھی گنتی کے صرف تین نثر نگار لیے ہیں باقی کو باقی ہی رہنے دیا ہے اور جن پر قلم اٹھایا ہے ان پر بھی سیر حاصل لکھنے سے احتراز کیا ہے۔ کیوں کہ تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ چند صفحوں میں۔ اس کے سمانے کی گنجائش کہاں؟ تاہم مدعا اس سے بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ وہ ادب بھی جسے ادب برائے ادب کہا جاتا ہے نقوشِ حیات سے خالی نہیں۔

انقلاب کی گھٹاٹوپ بدلیاں ہندوستان پر مدت سے منڈلا رہی تھیں۔ انجام کار برسیں اور ایسی برسیں کہ تہذیبِ قدیم کی بوسیدہ عمارت دھڑام سے آ پڑی۔ تخت و تاج چھنا۔ بساطِ سلطنت الٹ گئی۔ آزاد غلام ہوگئے۔ خاک نشیں صدر نشیں اور صدر نشیں خاک نشیں بن کر رہ گئے۔ ہزارہا بے نشان ہوگئے۔ گور و کفن بھی میسر نہ آیا۔ جن کے سہارے خاندان پلتے تھے نانِ شبینہ کو محتاج ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب کیا آیا۔ زمین و آسمان بدل گئے۔ شرافت کا معیار بدلا طرزِ معاشرت و طریقِ تمدن میں فرق آیا۔ رجحانات بدلے غرض کہ زندگی کا ڈھانچہ ہی تبدیل ہوگیا۔

زندگی بدلتی ہے تو ادب میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ کچھ وقت تو ماتم میں گزرا شہر آشوب[۱] لکھے گئے۔ اور دھوم دھام سے لکھے گئے۔ جب اس سے فراغت ملی

[۱] [illegible] ۱۳۱۳ھ

توحساس دلوں میں پستی کے احساس نے چٹکیاں لینی شروع کیں۔ قسمت سیدھی تھی اور دن پھرنے تھے۔ آزاد نے جدید رنگ کی اردو شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ جدید رنگ کی اردو شاعری کا سنگ بنیاد کیا تھا۔ دراصل تحریکِ آزادی کا سنگِ بنیاد تھا۔ آزاد تو آزاد ہی تھے۔ دوچار ردّے لگا کر الگ ہو گئے۔ مگر حالی نے اس عمارت کو اُوپر اٹھایا۔ درد واثر کے باوجود حالی کی شاعری میں ناصحانہ رنگ بھی ہے۔ یہ رنگ ضرورت کا مؤید ہے۔ قوم کے لیے جن افکار و اعمال کی ضرورت تھی۔ ان کی دعوت دی۔ جو چیزیں مضر اور مہلک تھیں ان سے متنبہ کیا۔ گویا کہ حالی کی شاعری وہ شاعری ہے جسے ادب برائے زندگی کہا جاتا ہے۔ اس میں سدھار ہی سدھار ہے۔ بگاڑ کچھ بھی نہیں۔ مسدس مدوجزرِ اسلام۔ بیوہ کی مناجات چپ کی داد۔ ان کی نظموں کے عنوان خود مونھ سے بڑے بول رہے ہیں کہ وقت کے تقاضے کو پورا کیا گیا ہے۔

اکبر الہ آبادی۔ سرور جہاں آبادی اور اسمٰعیل میرٹھی۔ ان کے ہم نوا ہیں اکبر نے طنز و ظرافت سے مغربی تہذیب کی بدعنوانیوں پر چرکے لگائے سرور نے گنگا۔ پدمنی۔ اور وید مقدس کے روپ میں قدیم عظمت کو اُجاگر کیا اور بالواسطہ اچھے کردار کی تلقین کی۔ اسمٰعیل نے یہ بھی کیا اور وہ بھی۔ بچوں کو بھی سنبھالا۔ ان کے لیے بھی ان کے اسلوب میں نظمیں لکھیں۔ اور قدیم عمارتوں پر بھی انھوں نے دونوں کو سنبھالا۔ چھوٹوں کو بھی بڑوں کو بھی۔

یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال و چکبست بھی نہ ہوتے۔ فی الحقیقت یہ حالی ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔ حالی کی دل ہلا دینے والی

آواز نے دلوں کو ہلا دیا۔ کچھ لکیر کے فقیر آڑے بھی آئے مگر آڑ نہ بن سکے۔ دل سے نکلی تھی۔ دلوں میں جا اتری۔ چکبست نے گو عمر کم پائی۔ مگر وہ کچھ کر گئے۔ جو عمر نوح پانے والوں سے بھی نہ بن پڑا۔ قومی۔ سیاسی۔ مذہبی۔ اصلاحی نظمیں لکھیں اور اس انداز میں لکھیں جو لکھنے کا حق تھا۔ غزلیں بھی کہیں مگر رسمی نہیں۔ حقائق سے بھرپور اور صداقت کی ترجمان۔ کیا پُر لطف انداز بیان ہے۔ کیا تخیل ہے اور کیا احساس ہے۔ تعریف سے مستغنی ہے فرماتے ہیں ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا! جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی نظروں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

دل میں یوں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

اقبال نے زمانے کے نشیب و فراز چکبست سے زیادہ دیکھے۔ دنیا کو بھی زیادہ ہی برتا۔ اپنی پستی کو بھی دیکھا۔ دوسروں کے عروج کو بھی دیکھا۔ وہ جہاں بیان جہاں گرد بھی تھے اور مرد متوکل و گوشہ نشین بھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی۔ وہ فلسفی کی نگاہ سے دیکھتے اور شاعر کی زبان سے کہتے جو کچھ کہتے تھے بانگ درا۔ ضرب کلیم اور بال جبرئیل میں کئی سو عنوان ہیں۔ اور ہر عنوان بجائے خود عنوانِ زندگی ہے۔

وہ ملک و ملت دونوں کو سنبھالتے ہیں۔ وہ ماضی سے بھی آگاہ ہیں اور مستقبل سے بھی۔ کبھی کہتے ہیں ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جنگِ عظیم کے اثرات۔ پست ماندہ طبقات کی خستہ حالی۔ روسی افکار اور مارکسی ادبیات کی مقبولیت۔ اہلِ ہند کی درماندگی۔ ان سب حالات نے ایک طرف کانگریس کی سرگرمیوں کو ہوا دی اور تیز کر دیا۔ دوسری طرف یہی خیالات ادب کے سانچے میں ڈھلنے لگے بلکہ قومی وملکی مفاد کے پیشِ نظر ڈھالے جانے لگے۔ "ترقی پسند ادب" اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جوش ملیح آبادی، شاعرِ انقلاب کے معزز لقب سے یاد کیے جانے لگے۔ ان کی بعض نظمیں انگریزی حکومت نے ضبط بھی کیں۔ لیکن انھوں نے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ ان کا رنگ بھی مطالعہ سے تعلق رکھتا اور طبقاتی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے۔ توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے۔ دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے۔ بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے۔ سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
ایک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

مرد کہتے ہیں اسے ۔او مانگ چوٹی کے غلام جس کی باتوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام

احسان دانش کا مزدور طبقے سے تعلق رہا ہے ۔ انھوں نے عمر کا ایک معقول حصہ مزدوروں ہی میں گزرا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں درد اس قدر ہے کہ وہ فن کی بارکیوں کا پابند نہیں ہو سکتا ۔لیکن ان کے جذبات سچے اور درد میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مزدور کی عید، مزدور کی دیوالی برسات اور مزدور وغیرہ نظمیں ان کے شاہ کار ہیں بلکہ سماجی مظالم کے دل ہلا دینے والے مرثیے ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف مزدور طبقے میں احساسِ خودی پیدا کیا بلکہ ہر دردمند دل کو مزدوروں کا بہی خواہ بنا دیا۔ وہ "ہسپتال" میں غریب مریضوں کی حالتِ زار کا نقشہ اتارتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

دوائیں باسی، خراب پوشش، نہ تازہ کھانا، نہ صاف پانی
نہ خون میں زندگی کی گرمی، نہ سانس میں جاں فزا روانی
نہ کوئی آثارِ تن درستی، نہ کوئی خدمت گزار ان کا
نہ ان پہ نرسوں کی مہربانی، نہ پاسباں غم گسار ان کا

احسان دانش کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز ہے۔ انھوں نے معاشی تفریق اور اقتدار پسندانہ ذہنیت کا بہت قریب سے مطالعہ کیا اور بلا تامل اس کا اظہار کر دیا ہے۔ 'شکاری دوست'، میں جنگل کے درندوں کو بستی کے درندوں پر

ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں شقی دل گرگ خو — چوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہ رگ کا لہو
ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں جو با صد اہتمام — کالجوں میں نوجوانوں کو بناتے ہیں غلام
ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں جو عشرت کے لیے — دام پھیلاتے ہیں بیواؤں کی عصمت کے لیے
لاکھ حیواں ہوں اخوت کو یہ کھو سکتے نہیں — بشر جیسے ایسے بے انصاف ہو سکتے نہیں
یہ کبھی آبادیوں میں آکے غراتے نہیں — یہ کسانوں اور مزدوروں کا حق کھاتے نہیں

ان کی ایک نظم ہے "باغی کا خواب" اس میں پیرانِ پارسا کا ذکر فرماتے ہیں ؎

ان کے ایمانوں میں رخنے تھے وفا میں داغ تھے — دل تھا ناقص دامنِ صدق و صفا میں داغ تھے
خانقاہوں میں دلوں کا مدعا بکتا رہا — مدتوں ان کی دکانوں میں خدا بکتا رہا

احسان دانش مزدوروں کے سچے ترجمان ہیں۔ ان کا مطالعہ کچھ بھی سہی، مگر یہ ان کی آپ بیتی ہے۔ اسی لیے اس میدان میں کوئی ان کا مدِ مقابل نہیں۔ فیض۔ ن۔م راشد۔ اسرار الحق مجاز۔ مخدوم محی الدین۔ یہ سبھی ترقی پسند ہیں۔ اور ان سب ہی نے اپنی شاعری میں حالاتِ زمانہ کی عکاسی کی ہے۔ ان کی شاعری فی الواقع حقائقِ زمانہ کی ترجمان ہے۔ مگر حقیقت نگاری کے دھوکے میں عریاں نگاری سے بھی نہیں چوکتے۔ یہی ان کے کلام کا بدنما داغ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی نئی تہذیب کی عکاسی ہے۔ مگر مضر ہے کہ اس سے مبتذل جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ اس باب میں ہری چند اختر کا تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے[1] وہ لکھتے ہیں:۔

"ترقی پسند کہلانے والوں میں سے معدودے چند سلجھے ہوئے

۱؎ جنون و ہوش (جوش ملسیانی) مقدمہ صفحہ ۳

افراد کو چھوڑ کر باقی حضرات نے ترقی پسندی کو ایک ہڑبونگ بنا ڈالا ہے۔ اُن کے نزدیک ترقی پسندی کی اولیں شرط یہ ہے کہ ادب کے تمام اصول اور معیاری قوانین سے رشتہ توڑ کر بے یقینی اور آوارہ خیالی کے لق و دق صحرا میں اندھا دھند اِدھر اُدھر دوڑتے پھریں۔ ادبی روایات، ان کے خیال میں صحت مند ادب کے لیے ہیضہ نمونیا اور تپِ دق کا اثر رکھتی ہیں۔"

اس بحث کے آخر میں باحتیاط تمام شاعرِ انقلاب کے کلام سے عریاں نویسی کا انتخابی نمونہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

عجب نوجوانی تھی اپنی بھی پیارے — نہیں بھولنے کے وہ کافر نظارے
سُن ایک چاندنی رات کی بات مجھ سے — ابھی تک مرے دل پہ چلتے ہیں آرے
وہ دہکتے سے پھول وہ مہکے سے غنچے — وہ بانکا سا چاند وہ چھٹکے سے تارے
وہ جادو کے جھول کے وہ چاندی کی موجیں — وہ بیلے کے تختے ندی کے کنارے
فلک پر دمکتے ہوئے ماہ و انجم — ندی میں جھلکتے ہوئے چاند تارے
وہ پہلو میں اک سیمبر نوجوانی — یہ کاکل بہاؤ یہ عارض بہارے
جبیں پر گلابی پسینے کے قطرے — پسینے کے قطروں میں تابندہ تارے
تبسم کی رو میں جوانی کی شوخی — جوانی کی شوخی میں گنگا کے دھارے
جھکے سے پپوٹوں میں وہ چشم تاباں — کوئی جیسے کاجل تکلف سے پارے
لیے مدبھری ادھ کھلی انکھڑیوں میں — رسیلے کنائے کٹیلے اشارے
رخِ لالہ گوں میں مچلتے ہوئے سے — جوانی کے شعلے جنوں کے شرارے

لب جو کبھی سینکڑوں پیچ و خم سے
تکلف سے چلنا وہ سینہ ابھارے
کبھی لیٹ جانا وہ کھنی لگا کر
کبھی بیٹھ جانا وہ میرے سہارے
وہ میرا یہ کہنا کہ گو بعدِ مدت
مگر تم میرے پاس آئیں تو بارے
وہ جھولا سا اک راگ غلطاں فضا میں
سجن آج آئے ہمارے دوارے
کبھی جلوہ گر تھی جو پہلو میں میرے
اسے کاش یہ کہہ کے کوئی پکارے
اٹھم ہی ندی اور میدان جل تھل
چلی آ لچکتی کنارے کنارے

شاعرِ انقلاب کی ایک اور نظم ہے "حسن اور مزدوری" اس کے بھی دو ایک شعر عریانی کی مد میں شمار ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے ؎

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
ہو رہا ہے جذب مہرِ خوں چکاں کے روبرو
کنکروں کی نبض میں اٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت
ہو رہا ہے کمسنی کا لوچ جزوِ سنگ و خشت
پی رہی ہیں سُرخ کرنیں مہرِ آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس، مے چمپئی رخسار کی
غم کے بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے

فکر سے جھک جائے وہ گردن تف اے لیل و نہار
جس میں ہونا چاہیئے پھولوں کا اک ہلکا سا ہار
آسماں جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آکے مزدوری کرے
کیوں فلک مجبور ہوں آنسو بہانے کے لیے
انکھڑیاں جو ہوں دلوں میں ڈوب جانے کے لیے
مفلسی چھانٹے اسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے
نازنینوں کا یہ عالم، مادرِ ہند آہ - آہ!
کس کے جورِ ناروا نے کردیا تجھ کو تباہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو زہر عشق میں ہو وہ ان میں نہیں۔ مگر اس کی تلافی اس کی ضبطی سے ہو گئی تھی۔ اب تو وہ از کار رفتہ ہی کیوں کہ تہذیب معاشرت کا دھارا ہی بدل چکا ہی۔ لیکن دلوں کو گرمانے اور جوانوں کو مجنوں بنانے میں یہ بھی کسی طرح کم نہیں۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں بھی حالات کی سچی ترجمانی ہی اور پست ماندہ طبقے کے دردناک حال پر اشک افشانی کی گئی ہی۔ گویا کہ ہر اعتبار سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہی کہ ہر قسم کا ادب اور ہر زمانے کا ادب، عہدِ تخلیق کے حالات و خصوصیات کا ترجمان ہوتا ہی۔

یہ ہمارے ادب کے ایک پہلو کا جائزہ ہی یعنی صرف حصۂ نظم پر تبصرہ ہی جو ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آیا اور انجام کار ترقی پسند ادب میں شمار ہونے لگا ہی۔ اب نثر کا بھی

سرسری جائزہ لینا ہے اور دیکھنا ہے کہ ہمارے نظریے کی تائید اس سے کہاں تک ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے عظیم انقلاب کے بعد ہماری نثر نے نظم سے بھی زیادہ انقلابی اثرات کو قبول کیا۔ خیالات تو بدلنے ہی تھے۔ اسلوب بیان بھی بدلا اور ایسا بدلا کہ چند ہی دنوں میں جو کچھ لکھا گیا وہ ادب العالیہ کے منصب کو پہنچا۔ ہوا یوں کہ میر امّن نے جو اسلوب قصے کے لیے اختراع کیا تھا۔ غالب نے اسی کو خطوط میں کارآمد بنایا۔ ماسٹر رام چند نے اور سرسید نے اسی کو علوم وفنون میں چالو کیا۔ یہ تدبیر کارگر بڑی اور مفید ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ سرسید کی علمی وادبی کوششوں سے نثر نگاری نے مستقل صورت اور منزلت حاصل کرلی۔

آزاد۔ حالی اور شبلی وغیرہ سرسید کے رفقائے کار بھی تھے اور اعلیٰ ترین صلاحیتیں بھی رکھتے تھے۔ ان بزرگوں نے زندگی اور ضروریات زندگی کو جس خوبی سے ادب کے سانچے میں ڈھالا وہ اپنے موضوع۔ اپنے مقصد اور اپنے اسلوب کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ قرنوں ان کا جواب نہیں ہوسکتا یہ زندۂ جاوید ہیں اور ان کے کارنامے بھی۔

سرشار بھی اسی عہد کے بزرگ ہیں۔ ان کے ہاں تعمیر بھی ہے اور تخریب بھی مگر تہذیب قدیم کی جو فرسودہ عمارت ان کے فلک شگاف قہقہوں سے منہدم ہوتی ہے۔ نذیر احمد اسی کے اینٹ چونے اور گارے مٹی سے اخلاقی ناول کا قصر نو تعمیر کرتے ہیں۔ ناول کو مقبولیت نصیب ہوتی ہے۔ نذیر احمد کے ناول اس عہد کی سوسائٹی اور اس عہد کی معاشرت کی چلتی پھرتی تصویریں بھی ہیں بلکہ خامیوں تک کی اصلاح بھی ان میں ہے۔

ناول کی نئے بڑھی اور خوب بڑھی بہت سے ناول لکھے گئے۔ اور اقتضائے حال کے مطابق لکھے گئے۔ مرزا ہادی رسوا نے حقیقت کے چہرے سے نقاب بھی اٹھا دیا اور برملا کہہ گزرے :-

"ناول نویس ان واقعات کو علی العموم تحریر کر دیتا ہے جو اس نے اپنے زمانے میں دیکھے ہیں یا اسے دوسری عبارت میں یوں کہیے کہ زمانے کی تصویریں جو اس کے دل و دماغ کے مرقع میں موجود ہیں ان ہی کی نقلیں اتار اتار کر ناظرین کو دکھاتا ہے۔ مگر جو چیزیں ہماری نظر سے گزر گئی ہیں اور ان سے ہماری طبیعت خود متاثر ہوئی ان کو ہم ناول میں لکھ دیتے ہیں"[1]

الغرض یہ احساس عام ہوتا چلا کہ جو ادب زندگی کی ضروریات کا حامل نہیں۔ وہ ادب نہیں مجذوب کی بڑ ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے اور اسی احساس کی بدولت ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو نظریے وجود میں آئے۔ اس وقت ہندوستانی عوام بیرونی سامراج کی چیرہ دستیوں سے جاں بلب تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا اقتصادی سنکٹ بہار پر تھا۔ کہ اقتصادی بدحالی اور عالم گیر بیکاری سے تنگ آ کر محنت و سرمایہ کی کشمکش نے جنم لیا۔ سیاسی نزاع بھی زوروں پر تھی۔ غریب پسے جا رہے تھے اور بے بس بنے تھے غرض کہ یہ حالات تھے جو پریم چند نے سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا اور محنت کش

---

[1] دیباچہ ذات شریف منقول رسالہ اردو اپریل ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۳۷۔

عوام کو اپنے افسانوں کا اور ناولوں کا ہیرو بنایا۔ کسانوں اور مزدوروں کی دکھ بھری داستانیں سنائیں۔ اور ادب کے ذریعے عوام کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی۔ سید احتشام حسین نے یہ ٹھیک کہا ہے[۱]:-

"اردو افسانے میں سماجی حقیقت پسندی کا آغاز ان ہی (پریم چند) کے افسانوں سے ہوتا ہے۔"

آخر کار یہ روش چل پڑی اور افسانوں اور ناولوں میں راج کماریوں شاہزادوں شاہزادیوں اور پریوں کی جگہ محنت کش عوام کو مل گئی۔ پریم چند نے اور ان کے ماننے والوں نے افسانے اور ناول کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ وہ حقیقت کی روشنی سے منور نظر آنے لگے اور یہ گروہ ترقی پسند ادیبوں کا گروہ سمجھا جانے لگا تھی کہ سنہ ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی جس کی صدارت پریم چند ہی نے کی اور نہایت پر زور خطبہ پڑھا جو ادب میں خاص مقام رکھتا ہے اور دستور العمل بنانے کے لائق ہے۔

ترقی پسند ادیبوں نے خوب کام کیا اور بڑے اچھے اچھے ناول اور افسانے لکھے۔ مگر تھوڑے ہی دن کے بعد وہ غلط فہمی کے شکار ہو گئے اور جنس نگاری اور عریاں نویسی کو حقیقت نگاری سمجھ بیٹھے۔ نتیجۃً ملک میں مخالف آواز اٹھی اور یہ بھی سنبھل کے کام کرنے لگے۔ ہنسراج رہبر نے خوب لکھا ہے[۲]:-

[۱] پریم چند ہنسراج رہبر پیش لفظ صفحہ ۱۲ نعمانی پریس دہلی سنہ ۱۹۵۰ء
[۲] پریم چند (اپنی بات) صفحہ ۱

"اس کے بعد ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک دور ایسا آیا جب
جنس نگاری اور تحلیلِ نفسی کا نام ترقی پسندی تھا........ مگر
بھول جلد سدھر گئی۔"

الغرض کچھ دنوں ترقی پسند ادب جنسی میلانات کی دلدل میں پھنسا رہا۔ طوائفوں اور عصمت فروشوں کی زندگی سے خوب خوب آب و رنگ پایا۔ نقّاد آگرہ اور نگار لکھنؤ نقیب اور علم بردار بنے رہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ افسانے کو ترقی ہوئی اور اگرچہ ناول کم لکھے گئے مگر جو لکھے گئے فن کے اعتبار سے پہلے سے بہتر لکھے گیے۔

بہر حال ترقی پسند ادب جلد ہی اس دلدل سے نکل آیا اور سنبھل گیا جس کی بدولت اچھے اچھے لکھنے والے اور کام یاب افسانے اور ناول وجود میں آئے قاضی عبد الغفار کا ناول "لیلیٰ کے خطوط" اچھا ناول سمجھا جاتا ہے۔ کرشن چندر کا اَن داتا۔ پشاور اکسپریس اور شکستہ۔ عصمت چغتائی کی چوٹیں۔ دوزخی اور ٹیڑھی لکیر۔ راجندر سنگھ بیدی کا گرم کوٹ اور بھول۔ منٹو کی کالی شلوار اسی طرح دوسرے فنکاروں کے اچھے اچھے ناول اور افسانے وجود میں آئے جو اپنے عہدِ تخلیق کے سچے ترجمان ہیں اور اس نظریے کی پرزور تائید کرتے ہیں کہ ادب اپنے زمانۂ تخلیق کے حالات و واقعات کا عکس اور اپنے مصنف کے رجحانات کا آئینہ ہے۔ اردو ادب ایسا ہی ادب ہے اور ہندستان کی زبانوں میں اردو ادب بڑی منزلت رکھتا ہے۔ آزادیٔ ہند کے لیے جو کچھ ہوا اس میں اردو کا بڑا حصہ ہے۔ آزادی کے متوالوں نے اس کا صلہ اسے کیا دیا۔ تاریخ اس کو دہرائے گی۔ برا ہے تو کلنک کا ٹیکہ ہے اچھا ہے تو سنہری حرفوں سے

لکھا جائے گا۔ تاریخ تو دُور کی بات ہے۔ ادب خود ہی بتا دے گا کہ جن کے حلقوں میں اس نے دودھ چوایا۔ پروان چڑھایا۔ آزادی دلائی وہ سپوت نکلے یا کپوت۔ ادب کا یہی طلسم ہے۔ جو کسی کے توڑے ٹوٹ نہیں سکتا۔ لہٰذا اس مضمون کو اسی جملے پر ختم کیا جاتا ہے کہ ادب کا اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو منقطع نہیں ہو سکتا۔

لائبریری

علم کی بزرگی اور بڑائی مانی ہوئی بات ہے۔ علم کی خدمت بہت بڑی خدمت ہے۔ علم سیکھنا اور سکھانا بڑی اچھی چیز ہے۔ علم روشنی ہے۔ علم دولت ہے۔ علم زیور ہے۔ ایک دانا نے کیا خوب کہا ہے:-

"علم مال داری میں زیور اور افلاس میں دولت ہے۔"

علم کے بغیر کوئی کام بہ خیر و خوبی سرانجام نہیں ہوتا۔ علم سے کائنات کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ بگڑے کام بنائے جا سکتے ہیں۔ خالی جسم ہی پر نہیں دلوں پر بھی حکومت کی جا سکتی ہے۔ غرض کہ یہ اختراع و ایجاد جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب کچھ اسی کی بدولت ہے ؎

یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا
یہی آدمی کو ہے بجلی پر اڑاتا۔
حالیؔ

لائبریری بھی علم ہی کی ایک شاخ ہے۔ جو علم کی ترقی اور پرچار میں بہت بڑی معاون ہے۔ زندہ قوموں کی نگاہ میں اس کی بڑی عظمت ہے۔ خوش نصیب اور جیتی جاگتی قومیں جب ترقی و تمدن کی راہ میں قدم آگے بڑھاتی ہیں تو ان کی نگاہ پہلے کتب خانوں ہی پر پڑتی ہے۔ اور وہ شمعِ علم پر پروانوں کی طرح گرتی ہیں۔ مسلمانوں کا اقبال جب عروج پر تھا تو یہی عالم ان کا بھی تھا۔ خواجہ حالیؔ نے سچ کہا ہے ؎

یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم
کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم

کسی طرح پیاس ان کی ہوتی نہ تھی کم   بجھاتا تھا آگ ان کی باراں نہ شبنم
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لدکر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر   حالیؔ

اسی طرح جب ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمنے لگے تو انھوں نے بھی یہی کیا۔ میر امّن دہلوی باغ و بہار کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ اردو کی زبان سے واقف ہوکر ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں۔ اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئیں۔"

اس ابتدا کی انتہا یہ تھی کہ شاہانِ دہلی اور اودھ کے گراں بہا کتب خانے، ٹیپو سلطان اور دیگر امرا اور مہاراجگان کے کتب خانے جو نادرات کے ذخیرے تھے ایک ایک کرکے وہ سب اپنے ہاں اٹھالے گیے اور یہی نہیں بلکہ انھیں جو کچھ ملا اور جہاں کہیں سے ملا اسے سمیٹا اور اپنے ملک و وطن کی زینت بنایا۔ لہٰذا وہ نادر کتابیں جو ہندوستان کی ملک اور ہندوستان کے لیے طرۂ امتیاز تھیں ہندوستان میں ان کا ہونا تو درکنار ہندوستانی ان کے ناموں تک سے واقف نہیں لیکن اہلِ یورپ ان سے واقف بلکہ مستفید ہیں۔

انڈیا آفس لائبریری کیا ہے؟ وہ ہندوستان ہی کا سرمایہ اور ہندوستانی ہی کا علمی خزانہ ہے جو بہ قول سرسید مرحوم "کتب خانہ نہیں کتابوں کا شہر ہے" انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ ہندوستان کی حکمرانی کو خیرباد کہا لیکن

وہ کسی طرح بھی انڈیا آفس لائبریری کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور یہ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ علمی عظمت ہی میں رازِ حیات ہے۔ چناں چہ جو قومیں علم سے گہرا شغف نہیں رکھتیں وہ ذلّت کے گڑھے میں جا پڑتی ہیں۔ جو قومیں علم کی برکت سے دست بردار ہوئیں سمجھ لو کہ ان کا اقبال گیا گزرا ہوا۔ اور وہ گور کے کنارے آ لگی ہیں۔

انگریزوں کی علم دوستی اور علمی شغف کا ایک کرشمہ لندن کا برٹش میوزیم بھی ہے جو بہ قول سر سید مرحوم "ایک بڑا جنگل ہے کتابوں کا۔" انگریزوں کے علاوہ جرمنی۔ فرانس اور امریکہ کی لائبریریاں بھی آپ اپنی نظیر ہیں۔

عہدِ قدیم میں اور اب سے کچھ پہلے یعنی عہدِ مغلیہ تک یہی کیفیت اہلِ ہند کی تھی اور ہندوستان علم و فضل کا بے پایاں سمندر تھا۔ بھانت بھانت کے پکھیرو اسی چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ عہدِ قدیم میں نوشیروانِ عادل کا نامی طبیب برزویہ ہندوستان آیا اور یہاں کی مایۂ ناز تصنیف ہتوپدیس یا پنج تنتر تحفتہً لے گیا۔ جس کا پہلوی میں یعنی اس وقت کی ایرانی زبان میں ترجمہ کیا جس کا نام کلیلگ ودمنگ رکھا۔ اور درسیات میں شامل کیا۔ انوارِ سہیلی اسی کا فارسی ترجمہ ہے۔ عہدِ عباسیہ میں ابن مقفع نے اس کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا۔ جس کا نام کلیلہ ودمنہ ہے۔ فقیر محمد گویا نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا جس کا نام بوستانِ حکمت ہے۔

اسی طرح چرک اور سشرت جو عہدِ قدیم میں ہندوستان کے نامی طبیب گزرے ہیں۔ ان کی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی میں ہوا اور ان ہی کی بدولت

اہلِ عرب علمِ طب کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ عربی زبان کے مصنف علانیہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کے طبیبوں سے فائدہ حاصل کیا ہے اور اس کے باوجود کہ جگ کے جگ بیت گئے مگر آج تک یہ کتابیں قابلِ قدر بلکہ سرمۂ چشم ہیں۔

غرض کہ ہندوستان علم کا سرچشمہ اور کتابوں کا گنج تھا۔ جس سے دنیا کو فیض پہنچتا تھا۔ اگر صرف کتب خانوں کے نام ہی لکھے جائیں تو ایک کتاب بن جائے۔ اس کثرت سے کتب خانے تھے۔ اور ان میں نادر اور بیش قیمت کتابیں تھیں۔ علماء، امرا اور سلاطین کا تو ذکر ہی کیا اس شوق کا یہ عالم تھا کہ اَن پڑھ بھی اچھے اچھے خوش نویسوں سے کام یاب کتابوں کی نقل کراتے سنہری اور روپہلی گل کاری سے آراستہ کراتے اور خوب صورت خوب صورت جلدیں بنوا کر ذخیرہ کرتے تھے اور فخر سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ آخر دورِ مغلیہ تک اہلِ ہند کے علمی ذوق کا یہی عالم تھا۔ اگرچہ ستارۂ اقبال کو گرہن لگ چکا تھا اور یہ سب کچھ قالبِ بے جان اور پیکرِ بے روح تھا، مگر بقول خاقانی شیروانی ؎

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

اس انتہائی پستی سے نقطۂ عروج کا اندازا ہو سکتا ہے۔ لیکن نحوست نے عیش و عیاشی کے پری تمثال روپ میں ہم پر سایہ ڈالا جس کے آسیب میں پھنس کر ہم خود رفتہ ہو گئے تو یہ ہمارا سرمایۂ حیات بھی سیلابِ فنا کی

رو میں بہہ گیا۔ اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد خصوصاً ہم سے چھن چھنا کر یورپ کی لائبریریوں کی زینت بن گیا۔

البتہ جب مصائب و مشکلات نے جھنجوڑا تو ذرا ہماری آنکھیں کھلیں، خوابِ غفلت سے کروٹ لی اور جب ہم میں احساسِ بیداری پیدا ہوا تو ہمارے بزرگوں نے پھر اس طرف توجہ کی گویا کہ اس وقت ہماری لائبریریوں کا وجود اسی احساس کا نتیجہ۔ اسی ضرورت کا تقاضا اور اسی نیک نیتی کا ثمرہ ہی جو ہمیں بہت عزیز ہونا چاہیے۔

لائبریری مشترک سرمایے کا بہترین مصرف ہی۔ تھوڑے سے خرچ سے ہر شخص اتنا فائدہ اٹھا سکتا ہی جو کسی تجارت سے نہیں اٹھا سکتا ہم اسے اگر "ہم خرما و ہم ثواب" کہیں تو بجا ہی۔

مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے، کسی لائبریری کے ہزار ممبر ہیں جو ایک روپیہ ماہانہ ادا کرتے ہیں۔ جن میں ہزار تو نہیں پانسو روپے ضرور کتابوں پر صرف کر دیے جاتے ہیں اور ہر ممبر کو ہر مہینے پانسو روپے کی کتابیں بہ آسانی پڑھنے کو مل سکتی ہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہی کہ بعض ایسی نایاب اور قیمتی کتابیں لائبریری کے مشترک سرمائے سے خرید لی جاتی ہیں جنھیں ہم بذاتِ خود خریدنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ مگر لائبریری کی بدولت ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی ہی کہ لائبریری سے ہمیں بہ یک وقت ہر قسم کی کتابوں کا اتنا ذخیرہ مل جاتا ہی کہ ہم نجی طور پر ہرگز فراہم نہیں کر سکتے اور اگر کسی ضرورت سے مجبور ہو کر ایسا کر بھی لیا جائے

تو ایسی کتابیں خریدنی پڑجاتی ہیں جو کبھی دوبارہ ہمارے کام نہیں آتیں اور اس طرح ایک معقول رقم ضائع ہو جاتی ہے۔

البتہ لائبریری کی صورت میں یہ دشواری ہرگز پیش نہیں آتی۔ کیوں کہ لائبریری میں وہ یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی کے کام آتی رہتی ہیں اور خدا کی مخلوق ان سے فائدہ اٹھاتی ہی رہتی ہے۔ مگر ان آسانیوں کا احساس اور ان کی قدر ان ہی کو ہو سکتی ہے جنھیں علم کا ذوق ہے مطالعہ کا چسکا ہے اور لائبریریوں سے کام پڑتا رہتا ہے۔

لائبریریاں ہمارے مشن کی اشاعت میں بھی بڑی مددگار ہیں۔ مکالے اسکیم نے ہمیں جس ڈگر پر ڈال دیا تھا اور ہم راہ راست سے بھٹک گئے تھے اور ڈانواں ڈول مارے مارے پھرتے تھے مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آتا تھا لہٰذا اب جو ہمیں ہوش آیا ہے اور ہماری روحیں جو ملکی جواہر ریزوں کی متلاشی ہیں سو اس کا علاج بھی اسی میں ہے کہ ہم لائبریریوں کے لیے وہ گراں بہا اور نادر چیزیں فراہم کریں جن سے ہماری روح کو تسکین ہو۔ ہمارے اسلاف کی عظمت رفتہ میں اضافہ ہو۔ اور ان کے فضل و کمال کی اچھوتی تصویریں ہمارے سامنے آجائیں اور ہم میں جان تازہ ڈال دیں۔ ہم میں غیر شعوری طور پر کسب کمال کی صلاحیت پیدا ہونے لگے اور ہم ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں۔

میری مراد اس سے یہ ہے کہ ہماری لائبریریوں میں مشرقی علوم کا قدیم ترین سرمایہ خواہ وہ کسی زبان میں ہو خصوصیت کے ساتھ فراہم کیا جائے۔ کیوں کہ قوم اپنی ماضی سے بے نیاز رہ کر نہیں پنپ سکتی۔ ہمارے بزرگوں کے بہت سے

ایسے کارنامے ہیں جنھوں نے ایک عالم سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہی اور آج بھی وہ یکتا اور بے مثل ہیں اور جنھیں ہمارے بزرگوں نے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے مدوّن کیا ہی اور جو اپنے فن اور اپنے معیار کے اعتبار سے عجوبۂ روزگار ہیں گو ہم اپنی نارسائی کی بدولت ان سے واقف نہیں ، اور استفادے سے محروم ہیں لیکن وہ دوسرے کے گھروں کی زینت ہیں اور وہ ان کی قدر کرتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہمارا یہ فرض ہی کہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اپنے میں پیدا کریں اور جس طرح بن پڑے انھیں حاصل کریں اور اپنے دل و دماغ کی انھیں زینت بنائیں ۔ یہ ہمارا قابلِ فخر کارنامہ ہوگا نیز یہ ہمارے لیے اور ہماری لائبریریوں کے لیے ایک اہم فرض ہی جسے پورا ہی کرنا چاہیے جو کسی نہ کسی طرح کرنا ہی پڑے گا۔ اگر بروقت ہوجائے تو کتنا اچھا ہی۔

بہت سے نادرات ایسے ہیں جو ہمارے ہی ملک میں ہیں مگر ناقدری کے ہاتوں برباد ہیں۔ ان میں سے بعض نا اہلوں کے قبضے میں ہیں اور کیڑوں کی خوراک بن رہے ہیں نہ وہ خود فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ کسی کو ان سے مستفید ہونے ہی دیتے ہیں وہ علم و فن کے راون ہیں جن کے ظلم سے کتابی مخلوق زندہ درگور ہی۔ ان سے بزرگوں کے یہ نادرات کسی نہ کسی طرح حاصل کر ہی لینے چاہئیں ورنہ افسوس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ہماری ہندوستانی حکومت نے نیشنل آرچیز کا ڈپارٹمنٹ قائم کرکے ملک و قوم پر بڑا احسان کیا ہی۔ یہ محکمہ قدیم اور نایاب کتابیں فراہم کرنے لگا

ہے جن سے ایک بڑی نیشنل لائبریری کو آراستہ کیا جائے گا۔ اور یہ بڑا مفید کام ہے خدا کرے کہ اس محکمے کو خاطر خواہ کامیابی ہو اور نیشنل لائبریری ملک کے لیے مفید تر ثابت ہو۔ مگر ابھی اس کا آغاز ہے۔ نہیں معلوم کب وہ وقت آئے گا۔ جو اس کا فائدہ عام ہوگا۔

ایک دشواری اور بھی ہے۔ جس کا حل انفرادی طور پر بہت ہی مشکل ہے۔ مگر لائبریری کی صورت میں البتہ اس قدر مشکل نہیں لیکن ابھی ہماری لائبریریں نے اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا یا کیا تو سہی لیکن اس طرف متوجہ نہیں ہوئیں۔ وہ دشواری یہ ہے۔ کہ ہمارے بزرگوں کی یادگار کچھ بچی کھچی کتابیں ہیں کہیں کہیں کسی کسی لائبریری میں ہیں۔ کوئی دکن میں ہے تو کوئی پورب میں۔ اور کوئی پچھم میں ہے تو کوئی اُتر میں لہذا ایک اُتر یا دکن کا رہنے والا پورب اور پچھم کی کتابوں سے کس طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ضرور خرچ کرنے پڑیں گے۔ پھر وقت بھی درکار ہے اور سفر کی دشواریاں بھی۔

اس کا حل یوں ہو سکتا ہے کہ ایک لائبریری دوسری لائبریری سے ایسے نادر نسخوں کی نقلیں حاصل کرے اور اس طرح ہر شہر کی مرکزی لائبریری میں ہر جگہ کے نایاب نسخے مہیا کر لیے جائیں تاکہ تحقیق کرنے والے آسانی سے مطالعہ کر سکیں اور فائدہ اٹھا سکیں۔ اور دوسرے کاموں کے لیے وقت بچا سکیں اور اسے کار آمد بنا سکیں۔

لائبریریوں کے سلسلے کی ایسی ہی ایک دشواری اور بھی ہے اور وہ یہ

ہے کہ ہماری ہر لائبریری چوں چوں کا مربہ ہے یا کباڑی کی دکان ہے جس میں
برا بھلا سب ہی کچھ ہے یعنی ہر قسم اور ہر علم و فن کی کتابیں ہر لائبریری میں ہیں
دو کسی میں چار کسی میں۔ ایک فن کی کسی کو کتابیں دیکھنی ہیں تو اگر شہر میں دس
لائبریریاں ہیں تو اسے مختلف اوقات میں دس جگہ جانا پڑے گا اور پھر بھی ضروری
نہیں کہ خاطر خواہ کامیابی ہو جائے۔

لہٰذا اس مشکل کا حل یہ ہے کہ لائبریریوں کو فنون کے اعتبار سے مخصوص کر دیا
جائے مثلاً کسی شہر میں دس لائبریریاں ہیں تو ہر لائبریری کو کسی ایک فن یا چند فنون
کے لیے مخصوص کر دیا جائے یعنی کوئی لائبریری اردو زبان کی قدیم و جدید
تصنیفات کے لیے مخصوص ہو۔ کوئی فارسی کے لیے۔ کوئی سنسکرت کے
لیے۔ کوئی ہندی کے لیے۔ کوئی انگریزی کے لیے۔ کوئی سائنس کے لیے۔
کوئی تاریخ کے لیے۔ غرض کہ لائبریریوں کی تنظیم ایسی ہو کہ تحقیق کرنے والوں
اور مطالعہ کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت ہو اور لائبریری میں کام
کرنے والوں اور مطالعہ کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت ہو اور
لائبریری میں کام کرنے والے بھی ایسے ہوں جو اپنے مزاج اور طبیعت کے
اعتبار سے اہلِ علم کو سہولت پہنچانا اپنا اخلاقی فرض تصور کریں ورنہ مطالعہ کرنے
والوں کو بڑی دشواری کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس سے ہر طرح کا نقصان ہے۔
یہ تازہ واقعہ ہے کہ، اگست ۱۹۵۵ء کو میں دہلی سے علی گڑھ گیا تاکہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں اور انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
کی لائبریری میں میرزا عبد القادر بیدل سے متعلق مطالعہ کر دں۔ لٹن لائبریری

میں عبدالشاہد خاں صاحب شیروانی اور سید سبط الحسن صاحب اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔ یہ دونوں صاحب بذاتِ خود فاضل اور بڑے علم دوست ہیں ان دونوں صاحبوں نے مجھے بہ سہولت مطالعہ کا موقع دیا۔ اور شریفانہ روش سے پیش آئے۔

انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں دو دفعہ گیا۔ لیکن وہاں جانا بالکل بے سود رہا۔ کیوں کہ لائبریرین صاحب کا ذوق میری معاونت نہ کر سکتا اور مجھے ناکام واپس ہونا پڑا۔ [۱]

خیر! یہ ایک تازہ واقعہ تھا جو زبان قلم سے بیساختہ ٹپک پڑا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ مطالعہ کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت ملنی چاہیے۔ اس میں ملک و قوم کا فائدہ ہے اسی سلسلے کی یہ بات بھی ہے کہ بڑے شہروں میں لائبریریاں گلی گلی اور کوچے کوچے ہونی چاہئیں اور تا وقتیکہ لائبریریاں کسی خاص نظم کے تحت نہ آجائیں محلہ لائبریریوں کا مرکزی لائبریریوں سے ایسا ربط ہونا چاہیے کہ وہ مطالعہ کرنے والوں کے لیے مرکزی لائبریریوں سے بہ آسانی کتابیں حاصل کر سکیں۔ اس طرح سہولت بھی ہوگی۔ وقت بھی کم صرف ہوگا اور کام بھی زیادہ ہوگا۔ جو ملک و قوم کے لیے بلکہ بنی نوعِ انسان کے لیے مفید ہوگا۔

لائبریریاں جس قدر زیادہ ہوں گی، جس قدر کامیاب ہوں گی۔ اسی قدر علم سے لگاؤ بڑھے گا۔ جہالت کی تاریکی دور ہوگی۔ اور علم کی برکت سے گئی گزری عزت دوبارہ حاصل ہوگی۔

مطالعہ کا ذوق بڑھنے سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اچھی کتابوں کی مقبولیت

---

[۱] ۱۹۶۳ء میں مجھے پھر علی گڑھ اور رامپور جانے کا اتفاق ہوا۔ علی گڑھ میں محترم حبیب خاں صاحب نے انجمن ترقی اردو کی لائبریری سے اور محترم عرشی صاحب قبلہ نے رضا لائبریری سے خاطر خواہ استفادہ کا موقع دیا جس کے لیے میں ان دونوں صاحبوں کا شکر گزار ہوں۔ "اخلاق"

بڑھے گی۔ اچھے اہلِ قلم کی قدر ہوگی ہمت افزائی ہوگی اور اچھے سے اچھا کام منظرِ عام پر آجائے گا۔ اچھے سے اچھے اہلِ قلم میں اضافہ ہوگا اور وہ ایسے نادر اور نایاب کارنامے پیش کرسکیں گے۔ جن سے ملک و قوم کو فائدہ بھی پہنچے گا اور آبرو بھی بڑھے گی۔ اور نہ صرف رہتی دنیا تک ایسے اہلِ قلم کا نام رہے گا بلکہ ان کی بدولت ہمیشہ ہمیشہ ملک سربلند رہے گا۔ اور ہمیں غیر ملکوں کے دست نگر اور محتاج ہونے سے نجات مل جائے گی جو بہت ہی بڑی بات ہے اور ایک آزاد ملک و قوم کے لیے نہایت ہی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اچھے اہلِ قلم کی کمی کا سبب اقتصادی مشکلات بھی ہیں اور اچھی کتابوں اور اچھی لائبریریوں کی کمی بھی ہے۔ ملک و قوم کو ابھارنے کے لیے ان دونوں ہی کمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے بلکہ اس کارِ خیر کے لیے پوری ہمت اور اخلاقی جرات سے پورا پورا کام لینا چاہیے۔ اگر یہ کام ہوگیا تو سمجھیے کہ ترقی کی بنیاد میں سیسہ پلادیا۔ جو ہلائے نہ ہل سکے گی۔

بہرحال لائبریریوں میں نہ صرف کتابیں ہی ہوں بلکہ معیاری رسالے اور اخبار بھی ہونے چاہئیں اور ہر قسم کے ہونے چاہئیں مگر ہوں معیاری ایسے نہ ہوں جن سے بہ قول مہدی افادی ابتلائے ادبی پیدا ہو کیوں کہ ناقص تحریروں سے نفع کی بجائے نقصان پہنچتا ہے۔

لائبریریوں میں بچوں کے لیے بھی معیاری کتابچے اور رسالے ہونے چاہئیں کیوں کہ بچوں کی تعلیم و تربیت بھی لازمۂ ترقی ہے۔ بچے قوم کی امانت ہیں قوم کے رازدار ہیں بلکہ قوم کی حقیقت کے ترجمان ہیں۔ اچھی قوم اور اچھے ماں باپ

وہی ہیں جن کے بچے اچھے ہیں۔ بچوں کا سدھار پوری قوم کا سدھار ہے۔ پورے
مستقبل کا سدھار ہے۔ بچوں کے لیے اچھا کتابی سرمایہ فراہم کرنا۔ اور انھیں اس
سے استفادے کا سلیقہ سکھانا ہمارا انسانی فرض ہے جس کو پورا کیے بغیر چارہ کار
نہیں۔ جن لائبریریوں کے نظام میں بچوں کی تربیت کے سرمایہ کی گنجایش نہیں
انھیں بنوت اور لاولد سمجھنا چاہیے۔ وہ بے اولادی ہیں اور خانۂ بے چراغ
ہیں۔

یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ لائبریری کو خالی ریڈنگ روم
بنائے رکھنا بھی ٹھیک نہیں۔ اگر کسی مفید چیز کا ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے یہ
اور بات ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ جو لائبریریاں اخبار و رسائل تک محدود ہیں وہ
اطلاعی یا اخباری اڈے تو ضرور ہیں مگر علمی کمال کی اشاعت کے مرکز نہیں
انھیں صحیح معنوں میں لائبریری نہیں کہا جا سکتا۔ اخباری تحریریں سطحی اور معمولی
ہوتی ہیں۔ ان سے اعلیٰ علمی ذوق ترقی نہیں کرتا۔ اور فطری صلاحیتیں بیدار
نہیں ہوتیں لہٰذا لائبریریوں کو اخبارات و رسائل کے لیے مخصوص کرنا۔ علم
کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنا ہے اور یہ بہت بری بات ہے اور بڑی شرم کی
بات ہے۔ اس سے ملک کو اور قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔
لائبریریوں کے مصارف کے لیے بجٹ میں گنجایش نکالی جا سکتی ہے۔
اس کے لیے یہ ہو سکتا ہے کہ ایسی سڑکوں پر روشنی کا انتظام نہ کیا جائے جن
پر رات کے وقت راہ گیر راستہ نہیں چلتے اور اگر چلتے بھی ہیں تو گاہ بہ گاہ
اکا دکا کوئی کوئی۔ یہ اچھا ہے کہ ایسی سڑکیں تعمیر نہ کی جائیں جن کا مقصود صرف

آرایش بلدہ ہے اور وہ صرف باد و باراں اور غسلِ آفتابی کے لیے وقف رہتی ہیں
مگر یہ کسی طرح بھی اچھا نہیں کہ خدا کی مخلوق کو جہالت کی تاریکی میں چھوڑ دیا جائے
اور ان کو علم کی برکات اور علم کی حقیقت نما روشنی سے محروم رکھا جائے
جہالت تاریکی ہے۔ گناہ ہے پاپ ہے۔ اس سے جہاں تک ہو سکے بچنے کی کوشش
کرتے رہنا چاہیے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے اور کھلی حقیقت ہے کہ ملک و قوم کی ترقی اور عروج
کے لیے علمی فضا ضروری اور لابد ہے۔ علمی فضا پیدا ہوتی ہے مدرسوں سے اور
لائبریریوں سے۔ بلکہ مدرسے بھی لائبریریوں کے بغیر علم کے پرچار اور اشاعت
و ترقی میں ناقص رہتے ہیں۔ ان سے پورا پورا فائدہ نہیں پہنچتا۔ کیوں کہ
مدرسے علم سے استفادہ کرنے کی استعداد اور صلاحیت پیدا کر سکتے
ہیں۔ ان کا نصاب محدود ہوتا ہے۔ اس لیے علم بھی محدود رہتا ہے۔ یہ کمی
دور ہو سکتی ہے تو لائبریریوں سے اور وہ بھی کام یاب لائبریریوں سے
ناقص سے نہیں۔

لائبریریوں سے علمی فضا بنتی ہے۔ شوق بڑھتا ہے۔ ولولہ پیدا ہوتا ہے
اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے جراتِ عمل رو بہ کار آتی ہے علمی شاہ کار وجود پاتے
اور جنم لیتے ہیں اور ایسے کام بہ آسانی ہو رہتے ہیں جن کا ہونا قومی اور
ملکی مفاد کے لیے ضروری ہے۔ اور یہی مدعا ہے جو بر آتا ہے۔ اور اس طرح
لائبریری کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

الغرض ملک کی ترقی کے لیے علم کی توسیع کے لیے، انسانی بہبودی کے

لیے اچھی لائبریریوں کا ہونا اور بہ کثرت ہونا ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم لائبریریوں کو مفید اور کارآمد بنانے کے لیے پوری توجہ سے کام لیں اور پوری طاقت صرف کریں۔ اور کوشش میں کوتاہی نہ کریں۔ اسی میں بھلا ہے۔ ع

کرو کچھ۔ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے

پنڈت کیفی

بابائے اُردو علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کشمیری پنڈت تھے۔ ان کا خاندان عہدِ فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) سے دہلی میں آباد ہے۔ اور دلی کا معزز خاندان گنا جاتا ہے۔ علم و فضل اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔

پنڈت کیفی ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء[لہ] جمعرات کو دلی میں پیدا ہوئے۔ دلی ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ یہیں پڑھے اور پروان چڑھے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس لیے نانا کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی جو ایک فاضل اور صاحبِ کمال بزرگ تھے۔

پنڈت جی کے والد کا نام پنڈت کنھیا لال تھا اور نابھ میں پولیس افسر تھے۔ کسی مقدمے کی تفتیش میں پٹیالی گئے اور وہاں سرگباش ہوئے۔ پنڈت جی کو اپنے والد کی جدائی کا بڑا قلق تھا۔ حتیٰ کہ ضعیفی کے عالم میں بھی جب وہ ذکر کرتے تو گویا زخم ہرے ہو جاتے تھے اور وہ عہدِ جوانی میں اس مقام کو دیکھنے بھی گئے تھے۔

پنڈت جی کا بچپن بازار سیتا رام دہلی کے مشہور محلے لال دروازے میں گزرا جو اہلِ کمال کا منبع تھا۔ وہیں کے ایک مکتب میں اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ وہ مکان اب تک موجود ہے جس میں یہ مکتب تھا۔ بازار سیتا رام میں لب سڑک اور گلی پنڈت پریم نرائن کے سامنے ہے۔ پختہ اور نہایت شکستہ مکان ہے۔

ایک دن میں اور پنڈت جی وہاں سے گزرے تو مجھ سے کہا ٹھیر جائیے۔ بید سے اشارہ کر کے کہا۔ اندر دیکھیے۔ میں جھجکا مبادا کوئی مزاحم ہو۔ مگر پنڈت جی کے اصرار پر جھانک کر دیکھا۔ کہنے لگے "ہے نا دائیں جانب دالان" میں نے کہا جی ہاں۔

لہ ۵ شعبان ۱۲۸۳ھ۔

فرمایا یہ ہمارا مکتب ہے۔ یہیں ہم بچپن میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ ایک مسلمان رئیس کا مکان ہے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ واقعہ کبھی لکھنا بھی پڑے گا۔ مگر اب یہ تمنا ہے کہ اس مکان کو قومی ملک قرار دیا جائے اور اس پر کندہ ہو۔ "کیفی کا مکتب" اور اسی میں کیفی لائبریری بھی ہو۔

ایک دن سہ پہر کے وقت جامع مسجد سے حوض قاضی کی طرف جا رہے تھے۔ بائیں پٹری پر تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ شاہ بولا کے بڑ کے پاس پہنچکر ٹھیر گئے۔ مجھ سے کہا اُدھر چلیے یعنی دائیں پٹری پر اُدھر چلیے۔ قبر کے پاس سے مالی واڑے کو ایک گلی جاتی ہے۔ شاہ جی کا چھتہ اسے کہتے ہیں۔ چھتے میں جا کر رک گئے۔ ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اسے دیکھیے۔ اس کے دروازے پر لوہے کی سلاخوں کے کواڑ تھے۔ میں نے کہا یہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف اس کا ایک بڑا دروازہ ہے فرمایا "یہاں ورنیکلر مڈل اسکول تھا۔ ہم یہیں پڑھا کرتے تھے مولوی سید احمد صاحب (مصنف فرہنگ آصفیہ) پڑھایا کرتے تھے پڑھاتے کیا تھے۔ اپنی کتابوں کی کاپیاں اور پروف پڑھتے رہتے تھے۔ ہم اپنے ڈھنگ سے۔ ہماری خوب چلتی تھی۔"

پھر کہا "وہ آپ کے بھی تو عزیز ہوں گے۔ وہ بھی تو عرب سرائے کے تھے۔" میں نے کہا جی ہاں! وہ میرے چچا ہوتے تھے۔ ان کی والدہ عرب سرائے کی تھیں۔ مجھے وہ خوب یاد ہیں پستہ قامت۔ سفید ڈاڑھی چندی چندی آنکھیں۔ سید حمید صاحب امام جامع مسجد دہلی ان ہی کے نواسے ہیں۔ یہ باتیں سن کر ایسے ہنسے جیسے دل کی کلی کھل گئی ہو۔

پھر کہنے لگے "انٹرنس تو ہم نے پاس کر ہی لیا کسی نہ کسی طرح سینٹ اسٹیفن کالج (کشمیری دروازہ دہلی) میں داخل ہو گئے تھے۔ ایف اے میں پڑھتے تھے۔ کیا کہیں

اخلاق صاحب ہوش سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ خیر ہمیں ایک معقول اسامی مل گئی اور ہم جالندھر چلے گئے۔" کچھ دن وہاں رہے پھر کپور تھلہ چلے گئے اور مہاراجا پرتاپ سنگھ کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے۔ پھر کشمیر لجسلیٹو کانسل کے سکریٹری ہو گئے اور مدتوں وہاں رہے۔"

لطیفہ:- ایک دن پنڈت جی کرسی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ میں پشت کی طرف کرسی پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایکدم مونھ پھیر کر بولے: "ہٹ جایئے"۔ اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں بیٹھیے"۔ پھر بولے ایک دن مہاراجہ ہری سنگھ (سابق مہاراجہ کشمیر) بھی اسی طرح آ کھڑے ہوئے تھے میں نے انھیں بھی ہٹا دیا تھا۔" میں نے عرض کیا پنڈت جی وہ مہاراجہ تھے میں آپ کا خورد ہوں کہنے لگے: "خورد و بزرگ کی کوئی بات نہیں بلکہ مجھے بار محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی گلا گھونٹنے کو کھڑا ہے۔"

بعد ازاں پنڈت جی کو اپنے لائق فرزند پیارے موہن سرگباشی کی جوان موت سے اتنا صدمہ ہوا کہ کمر ٹوٹ گئی اور خانہ نشین ہو گئے۔ مگر علم و ادب کی خدمت میں لگے رہے اور ان کے بچوں کی پرورش کرتے رہے۔

پنڈت جی فضل و کمال میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ ایسے باکمال خال خال ہی ہوا کرتے ہیں! انھیں اردو ہندی، فارسی، انگریزی اور پنجابی زبان پر فاضلانہ عبور تھا۔ سنسکرت اور عربی میں بھی دخل تھا اور کام چلا لیا کرتے تھے۔ عربی صرف و نحو (گرامر) اور تجوید کی کتابیں ان کے مطالعہ کا جزو اور ان کی لائبریری کی زینت تھیں حتیٰ کہ قرآن مجید بھی جزدان میں ملبوس ادب و احترام کے ساتھ ان کی الماری میں رہتا تھا۔ غرض کہ وہ ہفت زبان اور مستثنےٰ لیاقت کے آدمی تھے۔ مگر ان کے مطالعہ اور ان کے کمالات کا تمام تر منافع

اردو ہی کے حق میں تھا۔ جو ان کی مادری زبان تھی۔

شعر و شاعری سے انھیں فطری لگاؤ تھا اور یہ ذوق انھیں اپنے ایک بزرگ زبان داں ضمیر دہلوی سے ورثے میں ملا تھا پھر خواجہ حالی کی شاگردی بلکہ ان کے فیض صحبت نے اس ذوق کو اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ پنڈت جی فرمایا کرتے تھے: "ہم نے خواجہ حالی سے شاعری تو بس ایسی ہی سیکھی البتہ ان کی صحبت سے ہمیں تنقید آ گئی۔" ایک دن کیفیہ کا مسودہ سامنے رکھا تھا۔ برسبیل تذکرہ فرمایا: "خواجہ حالی کی صحبت نے ہم سے یہ کتاب لکھوا دی۔" ایک دن کیفیہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: "ہم نے خواجہ حالی سے جو کچھ سیکھا وہ یہ ہے۔" غرض کہ وہ خواجہ حالی کے بڑے مداح اور معترف تھے اور اکثر فیضِ صحبت کے ایسے واقعات سنایا کرتے تھے جن کا علم خواجہ صاحب کے سوانح نگاروں کو بھی نہیں۔

بہرحال خواجہ حالی کی صحبت نے انھیں کندن بنایا تھا لیکن حق یہ ہے کہ مبدأ فیاض نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ ایجاد و اختراع کی صلاحیت بھی ودیعت فرمائی تھی جس کے پرتو نے ان کے ادب کو جگمگا رکھا ہے اور جو اردو کے لیے طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے کتنے ہی نئے لفظ اختراع کیے تھے۔ مثلاً اڑتاؤ۔ تاریخ سیاس۔ ادبی سخت جان۔ ادبی ناداری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در اصل وہ لسانیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور یہی ان کا ادبی شاہ کار ہے۔ وہ کیفیہ کو زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ کہا کرتے تھے۔ کیفیہ کا موضوع بھی یہی ہے۔

نثر میں خیالات کو سلجھا کر ادا کرنے کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ الفاظ و محاورات برمحل ہونے ہیں۔ زور اور روانی بھی خاطر خواہ موجود ہے البتہ ادب العالیہ کی صنفِ نثر

پر شگفتہ نگاری کا بھی اطلاق ہوتا ہے جو اس کے شایانِ شان ہے۔ موضوعات کی شائستگی ان کا وصفِ خاص ہے۔

نثر اردو میں، منشورات۔ کیفیہ۔ نہتّارانا۔ مراری داد اور ترجمہ دریائے لطافت ان کی یادگار ہیں۔

نظم میں خیالات بلند ہیں اور نہ گہرے۔ نہ رنگین ہیں اور نہ فرسودہ۔ البتہ مفید و کار آمد ہیں اور شائستہ بھی۔ جدّت و ندرت کا وصف خاص ہے۔ اسلوب کی پختگی اور محاورۂ روزمرہ میں ان کا کلام منفرد ہے۔ حتیٰ کہ جس کسی کو اسلوب پر عبور نہ ہو وہ ادائے بیان سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ قدیم نظموں میں ثقیل الفاظ بھی ہیں۔

نظم میں، واردات۔ بھارت درپن۔ پریم ترنگی۔ جگ بیتی۔ خمخانۂ کیفی ..... یادگار ہیں۔ پنڈت جی کی تصنیفات پر تبصرہ ایک مستقل موضوع ہے۔ جو آیندہ کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پنڈت جی کی بعض کتابیں مثلاً کیفیہ۔ منشورات اور بھارت درپن ہندوستان و پاکستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں داخلِ نصاب رہ چکی ہیں۔ اور اب بھی ہیں۔ اور یہ مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔

پنڈت جی اوصاف و اطوار کے اعتبار سے جدید و قدیم تہذیب کے سنگم تھے! ان کے اوصافِ حمیدہ کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کے جشنِ آزادی ۱۹۴۷ء کی تقریب پر کل پاکستان مشاعرۂ کراچی کی صدارت کے لیے ہندوستان سے پنڈت جی ہی کو بلایا گیا۔ اور ناسازگار حالات کے باوجود انھوں نے وہاں جا کر صدارت کے فرائض انجام دیے۔

پنڈت جی اُردو کالج دہلی کے بانیوں میں تھے اور خود بھی درس دیتے تھے۔ آخر دم

تک کالج سے انھیں گہرا تعلق رہا چناں چہ جون ۱۹۵۴ء کے فوٹو گروپ میں وہ صدر نشین ہیں۔

پنڈت جی پستہ قامت خوش اندام اور دیدہ زیب آدمی تھے۔ سُرخ و سفید رنگ پتلے پتلے ہونٹ۔ لمبی ناک۔ بڑے بڑے کان۔ بھروان رخسارے۔ کشادہ پیشانی۔ سر پر باریک اور ہلکے بال۔ آنکھیں البتہ چھوٹی تھیں اور چشمہ لگاتے تھے عموماً سوٹ پہنتے اور ہیٹ لگاتے تھے۔ ہاتھ میں بید رکھتے اور بالکل یورپین معلوم ہوتے تھے۔ البتہ جب کسی مجلس میں جاتے تو شیروانی۔ فلٹ کیپ اور تنگ پاجامہ پہنتے تھے۔ جاڑے میں جبّہ پہن لیا کرتے تھے۔

جملے ہلکے ہلکے مختصر اور ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔ مگر اس طرح کہ دل میں اترتے چلے جاتے تھے۔ شعر تحت اللفظ مگر خاص انداز سے پڑھتے تھے مناسب محل وقفے سے کام لیتے۔ جس سے شعر میں جان پڑ جاتی تھی۔ یہی صورت مقالات پڑھنے کی تھی۔ البتہ جب تقریر کرتے تو شیر کی طرح گرجتے اور جتنا زیادہ مجمع ہوتا اتنا ہی انھیں انشراح ہوتا اور مجمع پر چھا جاتے تھے۔

انجمن ترقی اردو ہند سے ان کو دیرینہ علاقہ تھا۔ مگر ۱۹۳۸ء میں جب انجمن کا مرکزی دفتر دلّی آگیا تو انجمن نے پنڈت جی کی مستقل خدمات حاصل کرلیں اور پنڈت جی دلّی میں رہنے لگے۔ ان کا کمرہ دفتر میں سب سے الگ تھا۔ ایک دن جب بال بچے لال پور گئے ہوئے تھے۔ صرف ہری موہن ان کا چھوٹا پوتا ان کے پاس تھا اور اب پنڈت جی دن رات دفتر ہی میں رہنے لگے تھے۔ گرمی کے دن تھے اور دوپہر کا وقت ابھی پہنچا کمرے کے کیواڑ بند تھے۔ آہٹ سے پہچان گئے اور کہا کہ "آجایئے"۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ہاتھ آٹے میں بھرے ہوئے ہیں میں نے کہا یہ کیا؟ کہنے لگے "بھیّا ں صبح سے غائب ہے۔ ہری اب اسکول سے آتا ہوگا،

دل نہیں مانا اس کے لیئے دو روٹیاں ڈال لیں بھوکا ہوگا۔" پنڈت جی کا مرتبہ اور یہ کام مجھے سخت حیرت ہوئی۔ دراصل یہ بزرگانہ شفقت کا جذبہ تھا ورنہ ؎

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

غالباً ۱۹۴۲ء تک وہ انجمن میں رہے اور علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ انجمن کے پندرہ روزہ اخبار "ہماری زبان" کے اڈیٹر بھی تھے۔ اس زمانے میں جیسے محققانہ ادبی مضامین ان کے قلم سے نکلے ایسے نہ کبھی پہلے "ہماری زبان" میں شائع ہوئے اور نہ اس کے بعد آج تک یہ بات اسے نصیب ہوئی۔

اس کے بعد پنڈت جی سخت علیل ہوگئے اور اپنے صاحبزادے سر ندموہن کے پاس لائل پور چلے گئے جو وہاں کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ ۱۹۴۷ء تک وہیں رہے ۱۹۴۷ء میں تباہ و برباد ہو کر بمبئی پہنچے جہاں ان کے بڑے پوتے رام موہن ٹاٹا کمپنی میں کسی عہدے پر سرفراز تھے جو بعد میں امریکہ چلے گئے۔ پنڈت جی اپنے بڑے پوتے (سر گباشی پیارے موہن کے بڑے صاحب زادے) سے بڑے ہی خوش تھے اور ان کی سعادت مندی لیاقت اور جفا کشی کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ اب وہ کہاں ہیں۔ مجھے کچھ علم نہیں البتہ ہری موہن فوج میں کیپٹن ہیں۔

بمبئی سے پنڈت جی دلی آگئے اور سر گباشی لالہ سر یرام کی کوٹھی میں قیام پذیر تھے۔ کسی دن جامع مسجد آئے تو ملنے جلنے والوں سے مجھے بھی دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ میں زندہ ہوں اور یہیں ہوں میرا ادھر گزر ہوا تو احباب نے بتایا کہ پنڈت جی آئے تھے۔ فلاں جگہ مقیم ہیں۔ ملنے کے لیے کہہ گئے ہیں۔

میں بہ ہزار خرابی ملنے گیا۔ شیخ عبدالحق صاحب پراچہ بھی میرے ساتھ تھے۔

پنڈت جی مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ کھڑے ہو کر گلے لگایا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ دیر تک باتیں کرتے رہے اور انسانی درندگی پر لعنت ملامت بھیجتے رہے۔ کہنے لگے ہم ہندو مسلمان کو اپنے دو ہاتھ سمجھتے تھے دونوں ہی سنے ہیں خوب لوٹا جو کچھ یہاں تھا ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں وہ بھی لٹا لاہور اور لائل پور میں بھی یار لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے، ہنس ہنس کے یہ باتیں کرتے رہے۔

میرے حالات دریافت کئے، میں پہاڑ گنج دہلی میں رہتا تھا۔ تار تار میرا بھی لُٹ گیا تھا۔ گرمی کا آغاز تھا۔ میں سرج کی گرم شیروانی پہنے ہوا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ پنڈت جی کو یہ گرم شیروانی گراں گزری ہے۔ جب میں رخصت ہوا تو بڑی تاکید سے کہا۔ پھر بھی آنا۔ ضرور آنا۔ جلدی آنا۔ میں نے وعدہ بھی کیا اور معذرت بھی۔ اس لئے کہ حالات کا تقاضا کچھ ایسا ہی تھا۔

الغرض کچھ دنوں کے بعد میں گیا۔ تو کہنے لگے خوب آئے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں کہنے لگے۔ ایک بات ہم کہتے ہیں۔ آپ مان لیں گے۔ میں نے کہا جی ہاں کیوں نہیں اٹھے اور سوٹ کیس میں سے ایک ٹھنڈی شیروانی نکال کر لائے۔ نئی سلی ہوئی تھی۔ اور فرم کا لیبل لگا ہوا تھا۔ آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ آپ کو ہم دیتے ہیں۔" مجھے ایسا گمان بھی نہ تھا۔ میں بھچکا سا رہ گیا۔ دل دھڑکنے لگا ہاتھ کانپنے لگے۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ بول نہ سکا جیسے کسی نے گلا پکڑ لیا ہو۔ میں نے نیم بیخودی کی حالت میں ہاتھ آگے بڑھا دیئے اور اسے لے کر سر پر رکھ لیا۔ کہنے لگے۔ "میاں کیا کرتے ہو۔ پہن کر دیکھو" میں نے ارشاد کی تعمیل کی وہ میرے ٹھیک تھی۔ میرے ہی لیے سلوائی تھی۔ یہ واقعہ خود ایک حقیقت ہے۔ تعریف و توصیف کا محتاج نہیں وہ شیروانی میرے پاس آج تک موجود ہے۔

سخت حالات کے باوجود وہ دلّی ہی میں رہے اور علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے

لیکن وفات سے کچھ دن پہلے جب وہ نشست و برخاست سے معذور تھے۔ ان کے ایک عزیز انھیں غازی آباد لے گئے جہاں وہ کچھ دن علیل رہنے کے بعد پہلی نومبر ۱۹۵۵ء[1] منگل کے دن ۹۸ برس کی عمر میں اس دارفانی سے رحلت فرما گئے۔ اور علمی و ادبی خدمات مخلوق کی راہ نمائی کے لیے یادگار چھوڑ گئے۔ خداوند تعالیٰ ان کی آتما کو شانتی بخشے اور سرگ میں انھیں بلند مرتبہ عنایت فرمائے۔ آمین۔

پنڈت کیفی کا سانحہ ارتحال اردو ادب و زبان کے لیے عظیم ترین حادثہ ہے۔ جس کی تلافی ممکن نہیں ان کی وفات سے دلّی کی تاریخ کا ایک روشن پہلو روپوش ہو گیا گویا

ع ان کے مرنے سے مر گئی دلّی

موصوف کی تمام عمر اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزری اور ایسے زمانے میں کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل گئے۔ وہ اردو کے حق سے دست بردار نہ ہوئے بلکہ مرتے دم تک اپنے اصول پر قائم رہے۔

وہ ادیب تھے۔ شاعر تھے۔ نثر نگار تھے۔ زباں داں تھے۔ اہلِ زبان تھے اور نفسیات زبان کے ماہر تھے اور اس وصف میں کوئی ان سے لگا نہ کھاتا تھا۔ وہ منفرد و یکتا تھے اس لیے ان کی گراں قدر تصنیفات اور علمی موشگافیاں ہمیشہ اہلِ علم کی راہ نما رہیں گی اور منزلت پائیں گی موصوف مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ مجھے ان کی رحلت سے قلبی صدمہ پہنچا اور ایسا محسوس ہوا کہ اب دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ خدا ان کی آتما کو شانتی بخشے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
بارے بارے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

---

[1] ۱۵ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ۔

دہلی کالج

(قدیم و جدید)

اس درس گاہ کا نام مدرسہ غازی الدین تھا اور سنہ ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا تھا بعد ازاں سنہ ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج اس کا نام رکھا گیا۔ چناں چہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب دی بنگال اینڈ آگرہ ریبول گائڈ اینڈ گزیٹر سنہ ۱۸۴۲ء (جلد اول ص ۴۸) اور مسٹر ٹامسن .... کی رپورٹ ..... سنہ ۱۸۴۱-۴۲ء کے حوالے سے رقمطراز ہیں :-

"تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس درس گاہ یعنی مدرسۂ غازی الدین کی ابتدا سنہ ۱۷۹۲ء میں ہوئی .... اور سنہ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔" (مرحوم دہلی کالج ص ۲ مطبع مفید عام پریس لاہور سنہ ۱۹۳۳ء)

مزید تحقیق و تفحص کا نتیجہ ارقام فرماتے ہیں :-

"گورنمنٹ آف انڈیا کی تعلیمی اور دفتری تحریروں میں بھی مدرسے کے ابتدائی قیام کا سن ۱۷۹۲ء ہی لکھا ہے۔" (مرحوم دہلی کالج ص ۲)

میر محمد حسین صاحب دہلوی لکھتے ہیں :-

"پہلے سے دہلی کالج کے نام سے موجود تھا جس کو مقامی گورنمنٹ نے

سنہ ۱۷۹۲ء میں اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مقبرے کی ذوالربعۃ الزاویہ عمارت میں قائم کیا تھا"...... اورنٹیل کالج دہلی سنہ ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا۔

(مختصر تاریخ اینگلو عربک کالج دہلی مطبوعہ خواجہ برقی پریس دہلی سنہ ۱۹۳۳ء)

گو میر صاحب کا بیان قدرے پیچیدہ ہے تاہم اقتباسات بالا سے امور ذیل محقق و متبادر ہیں :۔

(۱) یہ مدرسہ ابتدا میں مدرسۂ غازی الدین کے نام سے منسوب اور مشہور تھا۔ جسے اورنٹیل کالج بھی کہا گیا ہے۔

(۲) مدرسہ غازی الدین (اورنٹیل کالج) کا سال قیام سنہ ۱۷۹۲ء ہے۔

(۳) دہلی کالج سنہ ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا۔ جو مدرسہ غازی الدین کی عمارت میں تھا اسے بھی بعض تحریروں میں اورنٹیل کالج ہی کہا گیا ہے۔

مدرسۂ غازی الدین کے تعلیمی کوائف

تعلیمی کوائف پر بھی نظر ڈالنے سے ایک روشن فرق دکھائی دیتا ہے۔ جس سے ہمارے بیان کو مزید تقویت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ناظم تعلیمات احاطۂ بنگال کے تعلیمی تبصرے اور سرکاری تحریروں کی مدد سے ڈاکٹر عبدالحق صاحب درج ذیل رائے کا اظہار فرماتے ہیں :۔

"اس کے سی سالہ حالات پر بالکل پردہ پڑا ہوا ہے، قیاس غالب یہ ہے کہ یہاں بھی مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم ہوتی ہوگی اور وہی رنگ ہوگا جو اس وقت دوسرے مدرسوں کا تھا۔ کیوں کہ

"...... ان مدرسوں میں بھی جو سرکاری کہلاتے تھے۔ مشرقی السنہ و علوم ہی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور ان میں وہی پرانا طریقۂ تعلیم۔ وہی حالات اور وہی رنگ تھا۔"
(مرحوم دہلی کالج ص۳)

سنہ ۱۸۲۴ء کے تعلیمی حالات

جب مسٹر ایچ ٹیلر نے سنہ ۱۸۴۲ء میں تعلیمی رپورٹ تیار کی تو اس میں انھوں نے مدرسۂ غازی الدین کے کوائف بھی قلم بند کیے چناں چہ اس رپورٹ کی روشنی میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب رقم طراز ہیں:۔

"البتہ مسٹر ایچ ٹیلر کی رپورٹ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۲۴ء میں مدرسۂ غازی الدین میں صرف نو طالب علم تھے اور مولوی عبداللہ ان کو تعلیم دیتے تھے۔"

گویا کہ تعلیمی کوائف سے بھی یہ امر واضح ہے کہ سنہ ۱۸۲۴ء تک یہ مدرسہ مشرقی علوم کا سرچشمہ تھا۔ اور مشرقی و مغربی علوم کا سنگم نہ تھا۔ جو دہلی کالج کا وصف خاص تھا۔

دہلی کالج کا قیام

دہلی کالج کے قیام سے متعلق کافی معلومات فراہم ہو سکتی ہے۔ لیکن اختصار کے پیش نظر صرف ایک رپورٹ کا اقتباس استشہاداً ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔

"سنہ ۱۸۲۳ء کے اواخر میں مجلس تعلیم عامہ نے ...... گشتی چھٹی دہلی ...... کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کی جس میں تعلیمی حالات دریافت کیے گئے تھے۔ (ص۳) ...... دہلی کی مجلس نے جنوری سنہ ۱۸۲۴ء

میں اپنا جواب بھیجا......... اس مجلس نے یہ بھی لکھا کہ دہلی...... میں (صہ ۴) .... اگر مجوزہ کالج قائم ہوگیا تو .... لوگ ضرور اس کی طرف مائل ہوں گے .... یہ کالج بلا تاخیر فوراً قائم کردیا جائے .... یورپی تعلیم اس کا خاص مقصد ہوگا. ....(صہ ۵)

ڈاکٹر عبدالحق صاحب مزید تحقیق و تفحص اور نقد و نظر کے بعد یہ نتیجہ اخذ فرماتے ہیں جو بالکل صحیح اور درست ہی:-

"اس مجوزہ کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا......... اور مسٹر جے ایچ ٹیلر پرنسپل مقرر ہوئے۔" (مرحوم دہلی کالج صہ ۶)

اس اقتباس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہی کہ دہلی کالج ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا۔ اور ۱۸۴۱ء تک اسی عمارت میں رہا۔

محلِ وقوع دہلی کالج ۱۸۲۵ء میں مدرسۂ غازی الدین کی عمارت میں قائم ہوا جہاں پہلے اورنٹیل کالج قائم تھا اور پرانی وضع سے تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ عمارت اجمیری دروازے کے باہر ہی۔ اور اس زمانے میں بھی شان دار اور قابلِ دید تھی اور اب بھی ایسی ہی ہی۔

چناں چہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب مسٹر ٹامسن کی رپورٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

"ابتدا میں یہ کالج غازی الدین خاں کے مدرسے میں تھا۔ چناں چہ مسٹر ٹامسن اپنی یادداشت .... ۸ر اپریل ۱۸۴۱ء میں

لکھتے ہیں کہ غازی الدین خاں کا مدرسہ جہاں دہلی کالج اس وقت ہے ایک شان دار عمارت ہے۔"
(مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۱۸-۱۲۰)

مولوی بشیر الدین صاحب لکھتے ہیں :-

"یہ عمارت دلّی کی مشہور اور دل کش عمارتوں میں ہے.......
.... اس عمارت کی خوب صورتی اور طرزِ تعمیر دور دور سے سیّاحوں کو متوجہ کرتا ہے۔"
(واقعات دار الحکومت حصہ دوم صفحہ ۵۶۳)
مطبوعہ شمسی پریس آگرہ سنہ ۱۹۱۹ء

عمارت کی ہیئت و ساخت

عمارت کی بناوٹ کا احوال ایک اہلِ قلم کی تصنیف سے منقول ہے جس سے عمارت کی شکل و شباہت بہ خوبی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ چناں چہ مندرج ہے :-

"نواب غازی الدین خاں نے یہ عمارت (سنہ ۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء میں) بنوائی تھی یہ عمارت مربع اور دو منزلہ تمام سنگِ سُرخ کی بنی ہوئی تھی جس کا وسیع احاطہ تین سو گز مربع ہے۔ اس کے تین دروازے نہایت عالی شان اور نہایت خوب صورت ہیں خصوصًا مشرق کی طرف کا صدر دروازہ[1] مدرسے کے اندر قدم رکھتے ہی اس کی عمارت کی خوب صورتی دروازوں ہی سے دل نشین ہو جاتی ہے۔

صدر دروازہ مشرقی دیوار میں ہے جس کی دو جانب اور دو چھوٹے چھوٹے دروازے بھی ہیں۔ جن کا راستہ صدر دروازے میں آ ملتا ہے اندر

---

[1] اب اس دروازے کو کمرے کی صورت میں منتقل کر لیا گیا ہے۔

جاکر ایک نہایت خوش نما اور وسیع صحن ۴ ۷ افٹ کا ملتا ہی۔ جس کے تین
رخوں پر متعدد دو منزلہ پختہ کمرے بنے ہوئے ہیں۔
مغرب میں ایک نہایت خوش نما اور وسیع مسجد ہو جو سرتاپا سنگ سرخ
کی بنی ہوئی ہی۔......... مسجد کے محاذ میں ایک بہت وسیع اور عمیق حوض
۲ ۷ فٹ مربع تھا جواب پاٹ دیا گیا ہی۔..........
مسجد کے شمال وجنوب میں اوپر نیچے دو چبوترے ہیں ....
شمالی چبوترے کے بالائی حصے کے نیچے .... تہ خانہ ہی.....
.... جنوبی حصے کے اوپر کے چبوترے پر سنگِ مرمر کی چار چار
نہایت نفیس اور باریک نقش و نگار کی کھدی ہوئی جالیاں ہیں
.... بیچ میں ایک دروازے کی جالی ہی اور فرش بھی
سنگِ مرمر کا ہی......... مجر کے اندر صرف تین قبریں . سنگِ مرمر
کی برابر برابر ہیں۔ جن میں سے بیچ کی قبر میر شہاب الدین غازی الدین خاں
اوّل بانی مدرسے کی ہی۔ داہنی طرف ان کے بیٹے چین قلیچ خاں نظام الملک
کی ہی۔ اور بائیں طرف ان کے پوتے غازی الدین خاں ثانی کی ہی.....
.........................."

(واقعات دار الحکومت حصہ دوم ص۵۶۴ تا ص۵۷۱)

بہرحال یہ عمارت نہایت خوب صورت تھی اور اب بھی ہی البتہ بعض عمارتوں
کا اضافہ کر دیا گیا ہی اور بعض عمارتیں منہدم کر دی گئی ہیں۔ اس عمارت میں ۱۸۴۱ء
کے بعد تک دہلی کالج رہا۔ بعد ازاں دار الشفا (ہسپتال) قائم کیا گیا۔ پھر

توپ خانے کی بارگوں کے استعمال میں آئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ۱ فروری ۱۸۹۰ء تک[۵] اس میں پولیس لین رہی۔ اور پھر یہ عمارت کرر مدرسے کی انتظامیہ کمیٹی کو دے دی گئی۔

اعتماد الدولہ فنڈ | اعتماد الدولہ مینا الملک نواب میر فضل علی خاں بہادر دہلوی سہراب جنگ وزیر والیِ اودھ نے ۱۸۲۹ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریزی ڈنٹ مقیم دہلی کو دیے تاکہ اس کی آمدنی سے دہلی میں ایک درس گاہ قائم کی جائے۔ لیکن گورنر جنرل کی تجویز کے مطابق نواب موصوف نے یہ فنڈ دہلی کالج کو تفویض کر دیا چناں چہ میر محمد حسین صاحب لکھتے ہیں :-

"نواب اعتماد الدولہ نے گورنر جنرل ان کونسل کی اس رائے کو جو بہتر مقصد لیے ہوے اور خوب سوچی ہوئی تھی منظور کر لیا"...... یہ پبلک تعلیم کی جنرل کمیٹی ۱۸۳۱ء کی رپورٹ......... میں درج ہے"

(مختصر تاریخ اینگلو عربک کالج دہلی ص۲)

نیز یہ بھی تجویز کیا تھا کہ کالج کے کسی نمایاں مقام پر ایک سنگِ مرمر کی لوح لگا کر اس فیاضی کی یادگار قائم کی جائے۔ چناں چہ مشرقی دروازے کی اندرونی محراب میں لوح لگا دی گئی جس پر حسبِ ذیل عبارت کندہ ہے:-

کتبہ

نہ بر لوح نقشے بماند ولیک
جزائے عمل ماند و نامِ نیک

---

[۵] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ص۱۷۵

بہ یادِ حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خاں بہادر سہراب جنگ کہ یک لکھ
ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقیِ علوم در مدرسہ ہذا واقع دہلی خاص مولد و موطنِ
خویش بہ صاحبانِ کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودہ اند، منقوش گردید، در
۱۸۲۹ عیسوی کتبہ سید امیر رضوی۔"

مدت تک یہ امداد دہلی کالج کے اینگلو ورنیکلر ڈیپارٹمنٹ کو ملتی رہی۔ ازاں بعد ۱۸۷۰ء میں ورنیکلر مڈل اسکول اس کی ایک شاخ قائم کی گئی جس کو عربک اسکول کہا جاتا تھا۔ اور ۱۸۷۲ء میں انگریزی تعلیم کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اس کا نام اینگلو عربک سکول ہوگیا۔ یہ درس گاہ وسطِ شہر میں تھی اور کرایے کے مکان میں تھی۔ میر محمد حسین صاحب فرماتے ہیں:-

"۱۸۷۰ء میں ایک ورنیکلر مڈل سکول پرانے کالج کی اینگلو ورنیکلر ڈیپارٹمنٹ کی (جو صرف نواب اعتماد الدولہ وقف ہی کی آمدنی سے عین منشاے واقف کے مطابق چل رہا تھا) بطور شاخ کے کھولا گیا۔

اس اسکول کو صحیح طور پر عربک اسکول کہا جاتا تھا اور ۱۸۷۲ء میں جب کہ اس میں انگریزی تعلیم شروع ہوئی اس کا نام اینگلو عربک مڈل سکول ہوگیا۔ یہ عین شہر میں کرایے کے مکان میں تھا جس کو اکثر تبدیل کرنا پڑتا تھا۔"

(مختصر تاریخ اینگلو عربک کالج دہلی صہ ۱)

الغرض کوئی پندرہ بیس برس تک یہ اسکول کرائے کے مکان میں رہا اور

بقول ڈاکٹر عبدالحق صاحب ۱۸۸۶ء میں[1] اور بقول مولوی بشیرالدین صاحب ۱۸۹۰ء کے بعد مدرسہ غازی الدین کی عمارت میں اسے منتقل کر دیا۔ جہاں اب تک موجود ہے۔ یہ اینگلو عربک مڈل اسکول ترقی کر کے ۱۸۸۹ء میں اینگلو عربک ہائی اسکول ہو گیا اور ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ کالج ہو گیا اور ۱۹۲۹ء میں ڈگری کالج بن گیا۔

ہنگامہ ۱۹۴۷ء (ستمبر) میں فرقہ پرستی کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا مگر جلد ہی سنبھال لیا گیا اور ۱۹۴۸ء میں[2] اس کا نام دہلی کالج رکھا گیا اور از سرِ نو شروع کر دیا گیا جو اب تک باقاعدگی سے چل رہا ہے۔

دہلی کالج کی نقلِ مکانی

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحقیق کے مطابق ۱۸۴۱ء کے بعد دہلی کالج کو کتب خانۂ دارا شکوہ کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا تھا جو کشمیری دروازے کے پاس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"۱۸۴۱ء .... کے بعد مشرقی اور انگریزی شعبے ایک کر دیے گئے تو کالج کتب خانۂ دارا شکوہ میں اٹھ آیا۔

یہ بھی ایک تاریخی عمارت ہے۔ کبھی کسی زمانے میں دارا شکوہ کا کتب خانہ تھا اس کے بعد (۱۶۳۷ء) علی مردان خاں مغل حاکم پنجاب کا اقامت خانہ رہا۔ ۱۸۰۳ء میں سر ڈیوڈ اخترلونی بارٹ کی ریزیڈنسی ہوئی۔ اس کے بعد کالج آیا۔ کالج کے ٹوٹنے پر ضلع کا مدرسہ اس میں رہا۔ اور پھر میونسپل بورڈ اسکول رہا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول رہا۔ اب اپریل ۱۹۴۱ء

---

[1] اسی زمانے میں خواجہ حالی بھی اینگلو عربک مڈل سکول میں استاد تھے۔

[2] روزنامہ انجام دہلی ۲۵ جولائی ۱۹۴۸ء

سے پولی ٹیکنک گورنمنٹ سکول ہی .... جب غدر ہوا تو کالج اسی عمارت میں تھا۔" (مرحوم دہلی کالج ص۱۱۱)

البتہ میر محمد حسین صاحب نے اس نقل مکانی کا سن بھی متعین کر دیا ہی۔ لیکن کسی رکارڈ سے حوالہ نقل نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"۱۸۴۴ء میں اس کالج کو ریزی ڈنسی کی مشہور عمارت واقع کشمیری دروازے میں (جس میں فی زمانہ گورنمنٹ سکول ہی) منتقل کیا گیا۔"

(مختصر تاریخ اینگلو عربک کالج دہلی ص۳)

لیکن رام بابو سکسینہ صاحب نقلِ مکانی کا سن ۱۸۴۳ء بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

"۱۸۴۳ء میں اسکول اجمیری دروازے سے منتقل ہو کر شاہی کتب خانہ میں آگیا۔" (تاریخ ادبِ اردو حصہ نثر ص۳ مطبع نول کشور لکھنؤ)

اس کے اور بھی شواہد ملتے ہیں کہ دہلی کالج مدرسۂ غازی الدین کی عمارت سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ اور اس عمارت میں لے آیا گیا تھا۔ جہاں اب پولی ٹیکنک گورنمنٹ سکول ہی اور جہاں پہلے گورنمنٹ ہائی سکول تھا۔ چناں چہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی زبانی لکھتے ہیں:۔

"فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں میں چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے۔ ایک روز کشمیری دروازے کی طرف گیا تو دیکھا کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہی۔ کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ سکول ہی۔" (رسالۂ اردو ص۴۰۶ جولائی ۱۹۲۷ء)

بہر حال یہ کالج پہلے مدرسۂ غازی الدین کی عمارت میں تھا۔ پھر کتب خانہ

دارا شکوہ کی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں لوٹ لیا گیا اور برباد ہو گیا ۱۸۶۴ء میں از سرِ نو قائم ہوا۔ اور میونسپل کمیٹی دہلی کی عمارت میں رہا۔ اور ۱۸۷۷ء میں توڑ دیا گیا۔ اور اس کا سارا عملہ لاہور کالج میں بھیج دیا گیا۔ یہاں صرف اسکول رہ گیا جو ۱۸۸۵ء میں اپنی قدیم عمارت مدرسۂ غازی الدین میں چلا گیا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں :۔

"جب غدر ہوا تو کالج اسی عمارت (کتب خانۂ دارا شکوہ) میں تھا۔ جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو اس پر فوجی افسروں نے قبضہ کر لیا تھا اور ۱۸۶۷ء تک وہ اسی میں فروکش رہے۔

" کالج یکم مئی ۱۸۶۴ء کو از سرِ نو قائم ہوا۔ اور ۱۸۸۷ء میں اپنی قدیم عمارت میں چلا گیا۔ درمیانی عرصے میں دہلی انسٹی ٹیوٹ یا موجودہ ٹاؤن ہال اور میونسپل کمیٹی کے اس حصے میں رہا۔ جو گھنٹہ گھر[1] کے بائیں جانب ہے جہاں بعد میں ایک مدت تک لائبریری رہی۔"

(مرحوم دہلی کالج صہ ۱۱۸)

مزید فرماتے ہیں :۔

" کالج ۱۸۷۷ء تک اچھا خاصا چل رہا تھا کہ نہ معلوم گورنمنٹ کے جی میں کیا آئی کہ اسے اپریل ۱۸۷۷ء میں توڑ دیا یعنی اس کالج کو لاہور کالج میں ضم کر دیا۔ .... دلّی اپنے عزیز کالج سے محروم ہو گئی اور سب اساتذہ اور طلبہ لاہور چلے گئے ....

---

[1] گھنٹہ گھر حادثہ ناگہانی کے باعث خود بخود گر پڑا۔ اور اب اس کی جگہ خالی پڑی ہے۔

کالج ٹوٹنے کے بعد یہاں صرف اسکول رہ گیا۔"

(مرحوم دہلی کالج ص ۷۱-۷۲)

یہ وہی اسکول تھا جسے عریبک اسکول کہتے تھے جو ترقی کرکے مڈل اسکول ہوا۔ پھر ہائی اسکول ہوا۔ پھر انٹرمیجیئٹ کالج ہوا اور انجام کار ڈگری کالج ہو گیا۔ اور اب وہی ۱۹۴۸ء سے دہلی کالج ہو گیا ہے جیسا کہ مندرج ہو چکا ہے:

۱۸۵۷ء میں کالج کا حشر

ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں جو غدر کے نام سے مشہور ہے۔ کالج کا بہت برا حشر ہوا۔ لٹا اور بہت بری طرح لٹا۔ انگریزی کتابیں پرزے پرزے اور سائنس کے آلات چورا چورا کر دیئے گئے۔ عربی فارسی کی قلمی کتابوں کے گٹھر کباڑیوں کے ہاتھ آئے اور دھاتیں کسیروں کے بھینٹ چڑھیں۔ کالج کے لائق پرنسپل مسٹر ٹیلر اور دوسرے انگریز اساتذہ تہہ تیغ کر دیے گئے۔ اور کالج تباہ و برباد ہو گیا۔ اور مدتوں بند پڑا رہا۔ کیوں کہ حالات کا تقاضا ہی یہ تھا۔ دہلی حشر کا میدان تھا اور ہر ایک کو نفسی نفسی کی پڑی تھی۔ کوئی سات برس کے بعد جب ذرا دم میں دم آیا اور امن جمی ہوئی تو کالج کی افادیت کا بھی خیال آیا اور اپریل ۱۸۶۳ء میں کالج از سر نو قائم کیا گیا۔ مگر پہلی سی بات پیدا نہ ہوئی۔ انجام کار توڑ دیا گیا اور لاہور کالج میں اسے ضم کر دیا گیا۔

کالج کے اساتذہ

کالج کو مغربی و مشرقی علوم کے ماہر اور لائق و فائق اساتذہ کی سرپرستی حاصل تھی جو نہایت دیانت داری

اور تن دہی سے خدمات انجام دیتے تھے ان میں سے مسٹر جے ایچ ٹیلر۔ مسٹر ایف تبروس ڈاکٹر اے سپرنگر ایم ڈی۔ مولوی مملوک علی۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ ماسٹر رام چندر ماسٹر پیارے لال آشوب اور مولوی ذکاء اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں آخرالذکر تینوں صاحب کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

کالج کے نامور طلبہ

دہلی کالج اپنی افادیت کے اعتبار سے اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی میں ایک بے مثل دار العلوم تھا جس کی آغوشِ تربیت میں ایسی برگزیدہ شخصیتوں نے پرورش پائی جن کے ناموں اور کاموں کو حیاتِ جاوید نصیب ہوئی۔ جن میں سے ماسٹر رام چندر۔ ڈپٹی نذیر احمد مولوی محمد حسین آزاد۔ ڈاکٹر ضیاء الدین۔ پیارے لال آشوب۔ موتی لال دہلوی (کشمیری پنڈت) پیرزادہ محمد حسین (سشن جج) میر ناصر علی (ڈپٹی) رائے صاحب لالہ کیدار ناتھ بانی رام جس کالج دہلی۔ مولوی کریم الدین۔ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی اور ماسٹر کیدار ناتھ قابلِ ذکر ہیں جن کے علمی ادبی کارنامے یادگارِ زمانہ ہیں۔

دہلی ورنیکلر سوسائٹی

کالج میں تصنیف و تالیف۔ نشر و اشاعت اور تراجم کے لیے ایک سوسائٹی بھی تھی۔ جو گراں قدر خدمات انجام دے رہی تھی گو اس کے ممبر اساتذہ ہی تھے۔ لیکن طلبہ بھی کافی مدد دیتے اور ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس سوسائٹی کی مطبوعات اگرچہ نایاب ہیں اور کسی کسی لائبریری کی زینت ہیں۔ لیکن نہایت وقیع۔ کار آمد اور ستایش سے بالاتر ہیں۔

ہمارے کسی کالج کو آج تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ ایسی کار آمد کتابیں مفادِ عام کے لیے منظرِ عام پر لائے۔ الا ماشاء اللہ۔ یہ تفوق صرف دہلی کالج ہی کے حصے

میں آیا جو اس کی بہترین یادگار ہی۔

دہلی کالج (جدید) اینگلو عربک کالج ہی کا نیا نام دہلی کالج ہی۔ جو ۱۹۴۸ء میں اسے تفویض ہوا۔ میں نے امتیاز کے لیے اس کو دہلی کالج (جدید) کے نام سے تعبیر کیا ہی۔ اس کالج کا نصابِ تعلیم وہی ہی جو عہدِ حاضر کے مروجہ کالجوں کا ہی۔ اور بہم دگر کوئی امتیاز نہیں۔ تاہم ہماری یہ تمنا ہی کہ یہ کالج بھی ایسی خدمات انجام دے کہ (قدیم) دہلی کالج کی طرح رہتی دنیا تک اس کا نام رہے۔ اور اس کی خدمات کو حیاتِ جاوید نصیب ہو۔ اور اس کے طلبہ ملک کی اور علم و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور ان کی خدمات یادگارِ زمانہ رہیں۔

مغالطہ آخر میں اس مغالطے کو رفع کر دینا مناسب محل ہوگا کہ بعض اہلِ قلم کو غالباً اس بنا پر کہ دہلی کالج کے بعض قدیم اور نام آور طلبہ سر سید اور حالی کے دوست اور رفقائے کار تھے یہ دھوکا ہوا ہی کہ سر سید اور حالی بھی دہلی کالج کے طلبہ میں تھے ان کا نام بھی طلبہ کی فہرست میں دے دیا ہی۔ مگر یہ مغالطۂ محض ہی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی دہلی کالج کا طالب علم نہ تھا۔ جیسا کہ درجِ ذیل شواہد سے واضح ہی:-

سر سید حیاتِ جاوید سر سید کی مستند سوانح حیات ہی۔ جو ان کے عزیز دوست خواجہ حالی کی تصنیف ہی۔ جس میں زندگی بھر کے حالات نہایت تحقیق و تفحص سے منضبط کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اپنے گوناگوں محاسن کے اعتبار سے نہایت موقر تصنیف سمجھی جاتی ہی اور اس پایے کی کتاب

ہو کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد آج تک کوئی سوانحِ حیات اس کے ہم پلہ معرضِ وجود میں نہیں آئی۔ اسی کا ایک اقتباس استشہاداً درجِ ذیل ہو جو سرسید کی تعلیم و تربیت سے متعلق، حقیقتِ حال پر روشنی ڈالتا ہو:۔

سرسید نے استانی سے .... قرآن پڑھا تھا.....
قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے ....
مولوی حمید الدین ایک ذی علم بزرگ آدمی ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے جنھوں نے ان کے ماموں کو پڑھایا تھا۔ ان سے معمولی کتابیں گویا .... پڑھیں فارسی میں گلستاں بوستاں .... سے زیادہ نہیں پڑھا.......... عربی میں .... مطول...... پڑھی .... اس کے بعد ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا...... ...... اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی ...... درسی کتابیں ...... اور رسالہ متوسطات ...... پڑھا
اسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے .... پڑھی .... مطلب بھی کیا پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔
جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہو تو اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی "

(حیاتِ جاوید صفحہ ۴۲،۴۱ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۱ء)

سرسید سنہ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۳۸ء میں سرشتہ داری کے عہدے پر متعین ہو گئے تھے۔ اس سے بھی یہ واضح ہو کہ یہی عہد ان کی تعلیم و تربیت کا زمانہ تھا جس میں ان کو دہلی کالج سے سابقہ نہیں پڑا۔ لہٰذا ان کے متعلق

یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ وہ بھی دہلی کالج کے طالب علم تھے۔

خواجہ حالی خواجہ حالی کے سوانح حیات سے قطع نظر خود ان ہی کا ایک بیان ہمارے پیش نظر ہے جس میں انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ طالب علم رہنا تو درکنار انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں اس درس گاہ کو دیکھا بھی نہ تھا۔ چناں چہ فرماتے ہیں:-

"اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی۔ وہاں .... انگریزی تعلیم کا .... ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا .... انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجھلے کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا۔ وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے

غرض کہ کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا تھا ڈیڑھ برس دہلی میں رہنا ہوا اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے نہ دیکھا اور نہ ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس کالج میں تعلیم پاتے تھے۔" (مقالاتِ حالی حصہ اول صـ ۲۶۴)

خواجہ حالی کے اس خود نوشت بیان کے بعد کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ مزید رفع شکوک کے لیے اگر ان کے سوانح حیات کو دیکھا جائے تو اس کی تائیدِ مزید ہوتی ہے۔ اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا بہ حیثیت طالب علم دہلی کالج سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

خواجہ حالی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور اپنے وطنِ مالوف پانی پت میں پرورش پائی۔ اور چوں کہ ان کے والد خواجہ ایزد بخش پر جنون کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس لیے اپنے بھائی اور بہن کے زیرِ نگرانی تعلیم و تربیت حاصل کی اور پانی پت ہی میں رہے۔ سترہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی جس کے بعد ۱۸۵۴ء میں وہ دہلی چلے آئے۔ اور ڈیڑھ برس دہلی میں رہے۔ جس کا ذکر مندرجہ بالا اقتباس میں ہے۔ اور اس مدت میں انھوں نے دہلی کالج کو آنکھ سے بھی نہ دیکھا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ملازمت کر لی مگر غدر ۱۸۵۷ء کی وجہ سے اپنے وطن واپس چلے آئے اور کوئی چار سال خانہ نشین رہے۔ بعد ازاں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہاں گیر آباد کے ہاں اتالیق ہو گئے اور آٹھ برس تک اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ اور تقریباً چار سال وہاں رہے۔ اس کے بعد اینگلو عربک مڈل سکول دہلی میں مدرس ہو گئے۔ اور ۱۸۸۷ء میں کہ جب وہ اسی درس گاہ میں مدرس تھے۔ سر آسمان جاہ سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے نظام گورنمنٹ سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ جس کے بعد وہ خانہ نشین ہو کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ اور ۱۹۱۴ء میں انتقال فرمایا۔ اور شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کی درگاہ میں دفن کیے گیے۔

بہرحال خواجہ حالی ہوں یا سر سید ان میں سے کوئی بھی دہلی کالج کا طالب علم نہ تھا۔ اور ان دونوں حضرات کو دہلی کالج سے وابستہ کرنا محض غلطی ہے جس سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیوں کہ دہلی کالج اپنی افادیت کے

اعتبار سے خود ایک منزلت کا مالک ہی اور اس کی علمی ادبی روشنی سے وہ عہد ایسا منور ہو گیا تھا کہ جس کی آب وتاب کی جھلک اب تک پائی جاتی ہی۔ اس کو فرضی امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں اور خواجہ حالؔی اور سرسیّد کو اس کے طلبہ کی فہرست میں شامل نہ کرنے سے اس کی عظمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آتا +

اسبابِ اضطراب

اضطراب کے معنیٰ ہیں —— بے قراری —— بے چینی —— تڑپ اور گھبراہٹ۔ حضرت وحشؔت لکھنوی فرماتے ہیں ؎

پہنچ جاؤں تڑپتا لوٹتا میں اس کے قدموں تک
اگر اے اضطرابِ دل تری امداد ہو جائے

طبیعت میں تڑپ۔ کرید اور ہیجان پیدا کر دینا عشق کا خاصہ ہی۔ لیکن اضطراب کی کمی بیشی کے مختلف ہی اسباب ہوتے ہیں اس لیے وہی اسبابِ اضطراب سمجھے جاتے ہیں۔ نیز چوں کہ عشق کی ابتدائی سرحد سے لے کر کمال کی حد تک بے شمار منازل ہیں اور ہر منزل میں بے شمار ہی اسبابِ اضطراب ہیں تو جب منازلِ عشق ہی کا تعین نہیں تو اسبابِ اضطراب ہی کا شمار کیسے کیا جا سکتا ہی۔ البتہ چند اسبابِ اضطراب بہ طور تمثیل درجِ ذیل ہیں :-

(۱) اضطراب کبھی محبوب ترین چیز کے چھٹنے اور جُدا ہونے سے پیدا ہوتا ہی۔

مومن خاں مومنؔ دہلوی فرماتے ہیں ؎

بہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومنؔ خدا کو بھول گئے اضطراب میں

قلندر بخش جرأتؔ فرماتے ہیں ؎

تیری جدائی کیسی بلا تھی کہ رات کو
دل کو طپش تھی جی کو مرے اضطراب تھا

(۲) کبھی عالمِ جدائی میں محبوب اور وصلِ محبوب کی باتیں یاد آتی ہیں اور محبت بھرے دل کو تڑپا دیتی ہیں اور پھر دل اضطراب رہتا ہے حضرت داغؔ دہلوی فرماتے ہیں ؎

میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا
وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا

(۳) کبھی خواہشِ وصلِ محبوب سے اضطراب پیدا ہوتا ہے اور دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ چناں چہ بدرِ منیر جب بے نظیر کو عالمِ جدائی میں یاد کرتی اور اس کے لیے بے قرار ہوتی ہے تو اس کی سہلیاں اسے سمجھاتے ہوئے کہتی ہیں میر حسنؔ دہلوی فرماتے ہیں ؎

نہیں خوب اتنا تمھیں اضطراب
نصیبوں سے شاید ملے وہ شتاب

(۴) کبھی شدتِ انتظار سے اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ شیخ قلندر بخش جرأتؔ فرماتے ہیں ؎

نہ جواب لے کے قاصد جو پھرا شتاب الٹا
میں زمیں پہ ہاتھ مارا بصد اضطراب الٹا

(۵) کبھی وفورِ شوق سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ دردؔ کا ارشاد ہے ؎

وفورِ شوق سے ٹھرا رہا ہے شعلۂ دل
مگر انھیں کوئی احساسِ اضطراب نہیں

(۶) محبوب کے آنے کی افواہ سے بھی اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہی سے

خبر سنی تھی کسی سے تمھارے آنے کی اسی لیے اضطراب میں بار بار آیا

(۷) کبھی کوئی حسین نظر پڑ جاتا ہی اور اس سے محبوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہی

اور دل کو تڑپا دیتی ہی اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں سے

یاد کر کے تم کو ای جان رو دیے سامنے جب اچھی صورت آگئی

(۸) کبھی افراطِ مسرت سے بھی اضطراب پیدا ہو جاتا ہی۔ مرزا غالب

فرماتے ہیں سے

میں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہی جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

(۹) کبھی شوخی و شرارت بھی اضطراب کے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہی۔

داغ دہلوی فرماتے ہیں سے

شوخی نے تم کو ڈال دیا اضطراب میں کچھ تمکنت کا لطف نہ دیکھا شباب میں

(۱۰) جب کبھی کسی سے بہت ہی زیادہ محبت ہوتی ہی تو اس کی تکلیف

بھی مضطرب اور پریشان کر دیتی ہی۔ خواہ اس کی حالت کا علم ہو یا نہ ہو۔

فطرت انسانی ایسے واقعات سے مملو ہی۔ چناں چہ بدرِ منیر کی حالت کا

نقشہ کھینچتے ہوئے میر حسن دہلوی فرماتے ہیں سے

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

(۱۱) کبھی تصویرِ یار کے دیدار سے بھی اضطراب پیدا ہوتا ہی۔ اخلاق

دہلوی نے کہا ہی سے

ہوتی ہی وحشت زدوں کی اور بھی وحشت سوا باعثِ تسکینِ خاطر کب تری تصویر ہی

(۱۲) کبھی محبوب کی پیاری پیاری باتوں سے بھی یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں ؎

سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

(۱۳) کبھی محبوب کی ملاقات سے بھی اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں ؎

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

(۱۴) کبھی رنج و غم کی حالت میں دلاسا اور تسلی دینے سے بھی اضطراب بڑھ جاتا ہے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں ؎

قلق اور دل کا سوا ہو گیا
دلاسا تمھارا بلا ہو گیا

(۱۵) کبھی خوش آوازی اور راگ راگنی سے بھی اضطراب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ چنانچہ بدرِ منیر جب بے نظیر کی یاد میں تڑپنے لگتی ہے اور کسی کل چین نہیں پڑتا اور وہی باغ جو اب تک گلزارِ ارم تھا۔ کاٹنے کو دوڑنے لگتا ہے۔ تو یہ سمجھ کر کہ راگ اور نغمے سے غم غلط ہو گا عیش بائی گائن کو بلا کر گانا سنایا جاتا ہے۔ لیکن الٹا ہی اثر ہوتا ہے۔ میر حسن دہلوی فرماتے ہیں ؎

کہیں سے کہیں لے اڑا اس کو راگ
ہوا سے ہوئی اور دونی یہ آگ

مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

(۱۶) کبھی محبوب کی چشمِ مست کا خیال آتا ہی اور دل قابو سے باہر ہونے لگتا ہی۔ اور اضطراب کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہی ؎

مجھے جس دم خیالِ نرگسِ مستانہ آتا ہی
بڑی مشکل سے قابو میں دلِ دیوانہ آتا ہی

الغرض زندگی میں اس قسم کے ہزارہا واقعات پیش آتے ہیں جن سے اضطراب اور بے چینی پیدا ہوتی ہی اور زندگی سراپا اضطراب معلوم ہونے لگتی ہی۔ خواجہ میر دردؔ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہی ؎

ہستی ہی جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں
جوں موج آ پھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں

گویا کہ اضطراب انسانی زندگی کا لازمہ اور عشق کا خاصہ ہی اور عشق انسانی جبلت میں داخل ہی۔ زندگی ہی تو اضطراب بھی ہی۔ جس دم یہ سلسلہ منقطع ہوا۔ حس و حرکت نے الوداع کہا۔ اضطراب رہا نہ بے چینی۔ بے قراری رہی نہ بے تابی۔ دنیا کی منازل ختم ہوئیں۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

شوخی

شوخی کے لغوی معنی ہیں۔ شرارت، چلبلا پن اور فرماں بردار نہ ہونا۔ جیسا کہ شیخ ناسخ لکھنوی فرماتے ہیں ؎

کرتا ہے مجھ سے ابلقِ ایامِ شوخیاں
پہچانتا نہیں مگر آ سن سوار کا

مگر اصطلاحِ ادب میں محبوب کی ہر وہ ادا جو عاشق کے محبت بھرے دل کو ٹھیس لگاتی ہے جو اس کے شیشۂ دل کو چور چور کر دیتی ہے جو اس کے خرمنِ دل پر بجلیاں گراتی اور اسے خاکستر کر دیتی ہے جو محبت کی شراب کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کر دیتی ہے۔ اور اس کے کیف کو بڑھا دیتی ہے شوخی ہی سے تعبیر کی جاتی ہے حضرت بیخود دہلوی فرماتے ہیں ؎

شوخیاں جب ان کی پردے سے نمایاں ہو گئیں
بجلیاں بن کر وہ چمکیں اور پنہاں ہو گئیں

غالب دہلوی فرماتے ہیں ؎

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اس کے علاوہ وہ تمام باتیں جو عام طور پر دلوں کو گدگدا دیتی اور ہنسی اور تمسخر کا باعث ہوتی ہیں۔ خواہ بچوں کی ہوں خواہ بوڑھوں کی کسی کی بھی ہوں شوخی ہی سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ مثلاً غالب دہلوی کا یہ کہنا ؎

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں! مونھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

شوخی ہی میں شامل ہے۔ اسی طرح لطائف و ظرائف بھی شوخی ہی سمجھے جاتے ہیں۔

تمنّا

تمنّا کے لغوی معنیٰ ہیں۔ خواہش، طلب اور آرزو .... اور شعرا کی اصطلاح میں بھی یہی معنیٰ مراد ہوتے ہیں کوئی خاص امتیاز نہیں جیسا کہ کتبِ ادب میں مرقوم ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر کا ارشاد ہے ؎

خاطر افگار خار خار ہوئی
جان تمنّا کشِ نگار ہوئی

غالب دہلوی فرماتے ہیں ؎

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنّائے نشاط
تو ہو۔ اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

استاد ذوق فرماتے ہیں ؎

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

مرزا غالب نے ایک موقع پر ستم ظریفی اور شوخیِ طبع کی کارفرمائی دکھائی ہی اور تمنا کو افسونِ انتظار سے تعبیر کیا ہی اور شعر کے ذوق و لطف کو دوبالا کر دیا ہی۔ فرماتے ہیں ؎

پھونکا ہی کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

شعری عنوانات اور اشعار کی تشریح

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہی بجلی گرا دینا (اکبر)

حیا کا سر سے اور ادا کا مسکراہٹ سے کیا تعلق ہی؟ بجلی کی موزونیت کا بھی اظہار کیجیے۔

بجلی گرانا۔ محاورہ ہی۔ جس کے معنیٰ ہیں دکھ دینا۔ صدمہ پہنچانا۔

.... شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی فرماتے ہیں ؎

کیا تری سونے کی بجلی نے گرائیں بجلیاں
طور ہی یہ ای پری پیکر مرا سینہ نہیں

شعر میں لفظِ بجلی نہایت موزوں۔ مناسب اور برمحل ہی۔ یہی لفظ ہی جس نے شعر کو ذوق کی جلوہ گاہ اور طلسمِ کیف و لذت بنا دیا ہی۔ یہی لفظ ہی جس سے عاشقِ زار کے دل کی کیفیت کا نقشہ ہو بہو آنکھوں میں پھر جاتا ہی اور یہی وہ لفظ ہی کہ جس نے شعر کی معنویت کو دو آتشہ کر دیا ہی۔ مگر حق یہ ہی کہ لطف اندوز ہونے کے لیئے ذوقِ سلیم درکار ہی۔ غالب دہلوی نے کیا خوب کہا ہی ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہی اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی۔

محفلِ عشرت ہی۔ کم سن محبوب دنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز بے فکر و غش رنگ رلیاں منا رہا ہی۔ عاشق کو بھی پتہ چل جاتا ہی۔ دیدار کا بھوکا عاشق چھپ لُپ کر کسی کونے میں جا دبکتا ہی۔ اور حرص بھری نگاہوں سے اس تصویرِ معصومیت کو گھورنے لگتا ہی۔ قضا عند اللہ محبوب کی نظر بھی اس پر پڑتی ہی۔ آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ شرم و حیا سے پانی پانی ہو جاتا ہی۔ اور فرطِ ندامت سے سر جھکا لیتا ہی موبنھ کو بھی چھپانے لگتا ہی۔ جو اقتضا ہی انسانی فطرت کا۔

یہ ادا سے دل نواز عاشقِ جاں باز کو ایسی بھاتی ہی کہ وہ پھڑک جاتا ہی۔

اس کے جذباتِ محبت میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ اس کے خرمنِ دل پر بجلی گر پڑتی ہے۔ اور رہ رہ کر اسے یہ ادا یاد آتی ہے۔ دل کو برماتی ہے اور پھڑکا پھڑکا دیتی ہے۔ ؎

رہ گئے، لاکھوں کلیجہ تھام کر
شوخ جس جانب یہ بجلی گر گئی

دیکھا! "حیا سے سر جھکا لینا۔" کتنا ستم پرور اور سحر آگیں ہے اور اس کیفیت کے اظہار کے لیے "بجلی گرا دینا!" کتنا موزوں اور کتنا مناسب اور برمحل ہے۔ اور کیسا جامع اور بلیغ جملہ ہے۔ مگر بات یہی ہے کہ لطف اندوز ہونے کے لیے دل چاہیے اور ذوقِ سلیم ورنہ اللہ بیلی ہے۔

ہاں! اب ذرا "ادا سے مسکرا دینے" کی ستم ظریفی بھی ملاحظہ ہو۔ یہ کلیہ ہے کہ کسی ستم زدہ درد مند کی حالتِ زار کو دیکھ کر مسکرا دینا اس کے زخموں پر نمک پاشی کرنا ہے اور یہ حد درجے کی بے مہری اور ستم کیشی ہے جو آئینِ اخلاق میں روا نہیں۔ اور پھر یہ سلوک عاشق کے ساتھ پناہ بخدا!! جس کا دل شیشے سے زیادہ نازک ہوتا ہے اور ٹھیس لگتے ہی چور چور ہو جاتا ہے ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم ......
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے ان آبگینوں کو

محبوب کا اس کی حالتِ زار پر اس بے اعتنائی اور بے التفاتی سے مسکرا دینا اس کے شیشۂ دل کو چور چور کر دیتا ہے۔ اور یہ برقِ تبسم اس کے خرمنِ دل کو خاکستر کر دیتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کسی کی زیست سے مطلب نہ جان جانے سے — انھیں تو کام ہے محفل میں مسکرانے سے

بہر حال اس ستم اور اس مسکراہٹ کو بجلی گرانے سے تعبیر کرنا کتنا بلیغ ہی اور کیسا جامع اور یہ شاعر کی سحر طرازی اور فسوں کاری ہی کہ ایک ہی لفظ سے شعر کو سراپا طلسمِ لذت بنا دیا ہی۔ بجلی کی اس موزونیت کی کیا داد دی جا سکتی ہی بلکہ حق یہ ہی کہ داد سے بالاتر ہی۔

یہ بھی واقعہ ہی کہ بجلی نے شعر کی معنویت کو دو آتشہ اور ذومعنی کر دیا ہی۔ چناں چہ ایک معنیٰ تو وہی ہیں جو اوپر گزرے کہ محبوب اپنے سر کو جھکانے اور حسنِ ادا سے مسکرا دینے سے عاشق کے شیشۂ دل کو چور چور کر دیتا ہی۔ لیکن دوسرے معنیٰ گو اتنے لطیف نہیں تاہم لطف سے خالی وہ بھی نہیں۔ بلکہ لفظ بجلی کے اظہارِ موزونیت کے لیے پُرلطف اور جامع متبتل بھی ہی۔ چناں چہ شاعر کہتا ہی کہ رات دن کا مشاہدہ ہی کہ ابرِ سیاہ فام پہلے فلک پر محیط ہوتا ہی۔ پھر بادل گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہی۔ اور کبھی کہیں ہی گر بھی جاتی ہی۔ تو اسے یہ کھٹراگ کرنا نہیں پڑتا۔ وہ تو یہ کرتا ہی کہ سر کو جھکا لیا، کالی کالی سیاہ فام زلفیں بکھریں اور ابرِ سیاہ بن گئیں۔ ادا سے مسکرا دینے اور موتی جیسے آب دار دانتوں کی چمک دمک سے جہاں گرانی چاہی بجلی گرا دی اور حسن کے خرمنِ دل کو چاہا خاکستر کر ڈالا۔ العظمۃ اللہ خیر صلاً۔

دیکھا! آپ نے کتنی سہولت سے کام بن گیا۔ فلک پر ابرِ سیاہ فام کی ضرورت پیش آئی اور نہ برقِ تپاں کی۔ اور کام بھی بہ خوبی سرانجام ہو گیا۔ یہ ہی حسن کی کارفرمائی اور محبوبیت کی شانِ دل ربائی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہی ؎

عشوہ و ناز و ادا سے مسکرانا آگیا
چشمِ بد دور آپ کو بجلی گرانا آگیا

الغرض حسینوں کو ستم ڈھانا اور جور و جفا کرنا آسان سی بات ہی جو چاہتے ہیں اور جب چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ انھیں نہ کوئی دقت سدِّ راہ ہوتی ہی اور نہ کوئی دشواری پیش آتی ہی۔ یہ ہی ناز و ادا کی جلوہ گری اور حسن کی کرم گستری۔

اب رہی یہ بات کہ حیا کا سر سے اور مسکراہٹ کا ادا سے کیا تعلق ہی۔ سو یہ ایک بدیہی امر ہی کہ جب شرم و ندامت اور حجاب دامن گیر ہوتا ہی تو انسان فطرتاً سر جھکا لیتا ہی۔ عاشق اس میں ایک لذت اور کیف پاتا ہی اور یہ ادائے دل نواز اس کے دل کو موہ لیتی ہی اور وہ از خود رفتہ ہو جاتا ہی۔ بلکہ محبوب کی محجوبی اور شرمساری سے وہ خود اس سے زیادہ شرمسار اور محجوب ہوتا ہی۔ اور اپنی منفعل کرنے والی جرأت کے گناہ کا اعتراف کرتا ہی اور محبوب سے معذرت خواہ ہوتا ہی۔ نظیری نیشاپوری نے کیا سچ کہا ہی ؎

تا منفعل زِ رنجشِ بے جا نہ دیدمش
می آرم اعتراف از گناہِ نہ بودہ را

نیز ادا کے ساتھ مسکرانے میں ایک لطیف اور پُر کیف اشارہ بھی ہی اور وہ یہ ہی کہ بجلی کی یہ عادت ہی کہ ادھر چمکی اُدھر نظروں سے غائب اور روپوش۔ حسینوں کے حسنِ ادا سے مسکرانے میں بھی یہی سحر اور افسوں ہی۔

کہ ذرا کی ذرا مسکرا لیے۔ خرمنِ دل پر بجلی گرائی اور پھر بن بیٹھے۔ جیسے انھوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ انھیں کچھ خبر ہی نہیں وغیرہ وغیرہ۔

خلاصۂ کلام یہ ہی کہ شعر بلیغ ہی پُرلطف ہی اور بے مثل مناسبات کا جامع ہی جو شاعر کے کمال کا وہ امتیاز ہی جس کو فنا نہیں البتہ گرادینا جو گرانا کا متعدی المتعدی ہی۔ ذوقِ سلیم کو گراں گزرتا ہی مگر یہ معمولی نقص اتنے کمالات کا ناسخ کیسے ہو سکتا ہی۔

(ب) نامہ بری

نامہ بر تجھ کو سلیقہ ہی نہیں
کام باتوں میں بنا کرتے ہیں
(داغ دہلوی)

نامہ بری میں کن آداب کی ضرورت ہی؟ شاعرانہ ہدایات قلم بند کیجے۔ اور واضح کیجے کہ کام کا باتوں میں بن جانا کیا معنیٰ رکھتا ہی؟

ادبیات کے گہرے مطالعہ سے یہ بات بالکل روشن اور اظہر من الشمس ہی کہ نامہ بری، سفارت اور قاصدگری کے لیے وہی لوگ منتخب کیے جاتے ہیں جو ہر اعتبار سے معتبر، ہر حیثیت سے کامل اور علم و ہنر، تحریر و تقریر نیز تجربات و سلیقہ شعاری اور اخلاقِ برگزیدہ کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔

چناں چہ بگڑے کاموں کو بنانا۔ روٹھے ہوؤں کو منانا اور وقت

اور موقع سے فائدہ اٹھانا۔ اقتضائے حال کو سمجھنا اور مصلحتِ وقت کو پیشِ نظر رکھنا۔ معاملے کے نشیب و فراز کی رعایت رکھنا اور خوب صورتی سے معاملات کو طے کر دینا ان کے اوصاف میں شامل ہے۔ نیز چوں کہ عہدِ قدیم میں یہ رسم عام تھی اس لیے یہ خیال بھی عام اور متداول تھا۔ حتیٰ کہ صلاح اور مشورے کے لیے بھی ان ہی برگزیدہ حضرات کو منتخب کیا جاتا تھا۔ چناں چہ متقدمین میں سے کسی کا ارشاد ہے ؎

قاصدا! بہرِ خدا کوئی تدبیر بتا
یا اسے لا کے ملا یا مرے لے جانے کی

اگر کسی کام کی اہمیت جتانی منظور ہوتی تو کہتے کہ اس کام کو تو قاصد بھی انجام نہیں دے سکتا۔ خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

لیکن اس کے باوجود کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ قاصد ہر جہت سے کامل اور کاروانی اور مطلب برآری کے ہنر سے متصف ہوتا ہے۔ تاہم عاشق طمانیتِ خاطر کے لیے بار بار فرائضِ نامہ بری کی یاد دہانی کرتا رہتا ہے کہ مبادا کوئی فرو گزاشت ہو جائے اور بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ چناں چہ فارسی زبان کے ایک صاحب کمال شاعر کا شعر ہے ؎

چوں من پیغامِ خود با قاصدِ دل دار می گویم
ز بیم آں کہ از یادش رود صد بار می گویم

منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی فرماتے ہیں ؎

رو کے اس شوخ سے قاصد مرا رونا کہنا
ہنس پڑے اس پہ تو پھر حرفِ تمنا کہنا

مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرتؔ موہانی فرماتے ہیں ؎

گراں گزرے نہ حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق تو اس مضمونِ رنگیں کو ادا کر دے

نواب اشرف علی خاں فغاںؔ دہلوی فرماتے ہیں ؎

خط دیکھو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ مرے نام کو ای نامہ بر کہیں

ایک نامعلوم شاعر کا شعر زبان زدِ خلائق ہی ؎

اس پتے سے ڈھونڈ لو قاصد مرے دل دار کو
چشمِ نرگس ۔ چال متوالی ۔ شباب آنے کو ہی

علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم (جلد پنجم ص۷۵ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۱ء) میں عربی شاعر وادا ء دمشقی کے چند اشعار کا ترجمہ کیا ہی ۔ چوں کہ وہ بھی مفید مدعا ہی ۔ اس لیے درج ذیل ہی ۔ فرماتے ہیں :-

شاعر کہتا ہی کہ " ای میرے دوستو! میرے معشوق کے پاس جاؤ اور اس سے باتوں ، باتوں میں کہو کہ " تم اپنے عاشق کی خبر نہیں لیتے اور اس کو تباہ کیئے ڈالتے ہو ۔ اگر وہ مسکرا دے تو حسن ادا سے کہو کہ " اس میں کیا نقصان ہی کہ بے چارے عاشق کو اپنے وصل سے کامیاب کرو ۔ " لیکن اگر اس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئیں تو بھلاوا دے کر کہہ دینا کہ ہم کو کیا غرض ہم تو اس کو پہچانتے بھی نہیں ۔ "

المختصر اس جملہ معلومات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہی کہ نامہ بری کے لیے قاصد کو اس ہنر مندی اور اس سلیقہ شعاری کی ضرورت ہی کہ وہ مدعا کو اس طرح خوش اسلوبی سے ادا کرے کہ محبوب کو بارِ خاطر نہ ہو۔ خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

صبا بہ لطف بہ گو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

بہ لطف بہ گو یعنی نرمی اور ادب سے پیغام دینا تاکہ ناگوار نہ گزرے۔ ع

گراں نہ گزرے نہ حرفِ آرزو اس طبع نازک پر

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کام خاطر خواہ اور آسانی سے انجام پذیر ہو جائے اور یہی اصل مدعا ہوتا ہی۔

اس شعر میں بھی فطرت نگار شاعر نے تعریضی پیرائے میں اسی مضمون کو ادا کیا ہی بلکہ خوش اسلوبی اور ندرت بیان سے اس کی خوبی میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ جس سے یہ شعر ذوق و کیف کی جلوہ گاہ بن گیا ہی۔

وہ کہتا ہی کہ "ای قاصد تجھے نامہ بری کا سلیقہ ہی نہیں آتا ورنہ جو اس ہنر میں کامل ہوتے ہیں وہ تو بڑی آسانی سے کام بنا لیتے ہیں دیکھ! نامہ بری کا سلیقہ یہ ہی کہ پہلے محبوب کو میٹھی میٹھی اور دل نواز باتوں سے پرچایا اور شیشے میں اتار لیا۔ پھر موقع محل کی رعایت سے باتوں ہی باتوں میں مطلب کی بات بھی کہہ ڈالی اور اس خوبی سے کہ اثر کا نشتر کارگر ہوے بغیر رہ نہ جائے۔ اس طرح بات ناگوار بھی نہیں گزرے گی اور کام بھی آسانی سے بن جائے گا۔"

چناں چہ مولانائے روم رحہ کے ارشاد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہی۔ وہ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

خوش تر آں باشد کہ سرِ دل براں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

حقیقت حال یہ ہی کہ باکمال شاعر نے چند اور مختصر الفاظ میں ان تمام ہدایات کو اور ان تمام آداب کو جن کی نامہ بری کے لیے ضرورت ہوتی ہی قلم بند کر دیا ہی۔ اور اس خوبی سے قلم بند کیا ہی کہ شعر ذوقیات کی جلوہ گاہ اور کیفیات کا مرقع بن گیا ہی۔ اور یہ شاعر کا بڑا کمال ہی۔

اس کے ماسوا باتوں باتوں میں کام بنانا زبان کا خاص جزو ہی۔ یہ محاورہ بھی ہی اور روزمرہ بھی۔ اور بڑی صفائی سے نظم کیا گیا ہی جس سے پتا چلتا ہی کہ شاعر کو زبان پر بے پناہ قدرت ہی جو اس بے ساختگی سے یہ جملہ نظم ہو گیا ہی جو معنی خیز بھی ہی اور کیف آور بھی۔

نیز اس فقرے نے شعر میں جان ڈال دی ہی اور اسے ذومعنی کر دیا ہی۔

چناں چہ ایک معنیٰ تو یہ ہیں:-

(۱) باتوں باتوں میں مطلب کی بات کہہ دینے سے آسانی کے ساتھ مطلب برآری ہو جاتی ہی۔ اور مطلب حل ہو جاتا ہی۔

دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ:-

(۲) جب قاصد سلیقہ شعار ہوتا ہی تو کام آسانی سے اور بخیر و خوبی سر انجام ہو جاتا ہی۔

اور دونوں ہی مقصد شعر میں بڑی خوبی سے نبھ گئے ہیں اور شاعر کا یہی بڑا کمال ہے۔ بہر حال شعر زبان کے اعتبار سے معنویت کے اعتبار سے اور تاثیر و اثر اور ذوق و کیفیت کے اعتبار سے قابلِ قدر اور لائقِ ستایش ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

(ج)

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا
(سیمابؔ)

شاعر کے نزدیک رونے اور ہنسنے کا حقیقی فلسفہ کیا ہے؟

یہ کلیہ ہے کہ شاعر جس قدر ماہر فطرت اور نفس شناسِ عالم ہوگا اور جس قدر قوتِ متخیلہ اور ممیزہ سے کام لے گا۔ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ چناں چہ اس شعر میں بھی شاعر نے قوتِ تخیل سے خاطر خواہ کام لیا اور ایک وسیع معلومات کے اہم نتیجے کو دو مصرعوں میں اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ اس کی لذت و خوش آہنگی سے سننے اور پڑھنے والے بیخود ہو جاتے اور جھومنے لگتے ہیں اور بیساختہ مونھ سے نکل جاتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شاعر کو کہنا یہ تھا کہ کسی کام کے ختم ہونے اور اس میں کامیابی حاصل ہونے سے خوشی ضرور ہوتی ہے۔ مگر اس دلبستگی اور انہماک کا ختم ہو جانا جو قدرتاً ہر کام کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے اور جس کی مشغولیت کے باعث بہت سے

فکر پاس تک نہیں پھٹکتے بے شک قابلِ افسوس اور تکلیف دہ ہی۔

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہی کہ شاعر حصولِ کام یابی کے لیے مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کرتا اور نئے نئے اسلوب اختراع کرتا ہی اور چوں کہ شعر گوئی سے اس کا مدعا اثر انگیزی اور تاثیر و شعریت ہوتا ہی۔ اس لیے وہ کبھی ان الفاظ سے بھی کام لیتا ہی جو عشق و جوانی اور رندی و شاہد بازی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان الفاظ میں قدرتاً کشش اور دل آویزی ہوتی ہی۔ چناں چہ خواجہ حالی فرماتے ہیں:-

"عشق و جوانی۔ رندی و شاہد بازی کے مضامین .... ہمیشہ سے دنیا میں مرغوب .... ہیں اور انسان کے دل کو بہ زور اپنی طرف کھینچتے ہیں۔"

(حیاتِ سعدی ص۵، محمڈن پریس علی گڑھ ۱۸۹۶ء)

الغرض چوں کہ شاعر کو اپنی وسیع معلومات کی بنا پر یہ پہلے ہی سے معلوم تھا اور وہ شاعر ہی کیا جسے اتنی بات بھی معلوم نہ ہو کہ شبِ ہجر سے زیادہ کوئی کٹھن شی نہیں۔ کسی مصیبت کے گزر جانے اور مقصد میں کام یابی ہونے سے خوشی ہوتی ہی۔ کسی کام کو مسلسل کرتے رہنے سے اس کے ساتھ دل بستگی اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہی جس کے انہماک سے ہزاروں کیا لاکھوں فکر پاس بھی نہیں آتے۔ اور صبح کے وقت عبادت میں قدرتاً دل لگتا ہی۔ اور دعائے سحر میں بہت ہی حظ حاصل ہوتا ہی۔

لہٰذا اس نے ہنسی سے خوشی۔ ہجر کی راتوں سے کام کی تکلیف رونے سے

افسوس اور لطفِ دعائے سحر سے کام کی دل بستگی مراد لی کیوں کہ علاوہ مذکورہ اسباب کے ایک سبب یہ بھی ہی کہ تمثیلی الفاظ سے کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہی۔ وسعت آجاتی ہی اور یہ خوبی پیدا ہو جاتی ہی کہ شعر ایک ہی قسم کے مختلف واقعات پر بلا تکلف چسپاں ہو جاتا ہی۔

غرض کہ اس نے اس سب معلومات کو ایک ایسے اسلوب اور نرالے ڈھنگ سے ترتیب دیا کہ شعر بہ درجۂ اولیٰ دل فریب اور دل کش ہو گیا۔

چناں چہ وہ کہتا ہی کہ شبِ ہجر کی وہ کٹھن راتیں جو کاٹے نہیں کٹتیں اور امیدِ وصل کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بادِ ناامیدی کے تند و سخت جھونکوں سے گل کیے دیتی تھیں۔ گزر گئیں۔ تو اگرچہ یہ بات قابلِ قدر اور لائقِ مسرت ضرور ہی۔ لیکن دکھ اس کا ہی کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ دعائے سحر کا لطف بھی جاتا رہا ہی۔ تو ایسے لطف کا فقدان اور ایسے کیف اور ایسی لذت کا معدوم ہو جانا کہ جس سے روح لذت یاب ہوتی تھی البتہ قابلِ صد افسوس ہی۔

لہٰذا اگر میں اس خوشی سے مسرور و خوش نود ہوں تو اس فقدان سے اندوہ ناک بھی ہوں گو یا کہ اس کے نزدیک کام یابی سے خوش ہونا اور دل چسپی کے فقدان کا افسوس کرنا رونے اور ہنسنے کا حقیقی فلسفہ ہی۔ اور یہ کلیہ بھی ہی۔ مگر شاعرانہ اندازِ بیان کی فسوں طرازی اور سحر سازی نے یہ بایہ الامتیاز خوبی پیدا کر دی کہ شعر طلسمِ لذت بن گیا ہی۔ اور مخصوص منزلت حاصل کر لی ہی۔ مرزا نے کیا خوب کہا ہی ع

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرف دار نہیں

(۱۵)

تم آج ہی چل پھر کے مٹا دو نہ یہ جھگڑا
کیوں کل پہ رکھو شورشِ غوغائے قیامت (انور)

ان کی رفتار کو ہمیشہ قیامت سے تشبیہ دی جاتی ہی یہ کیوں؟ شورش غوغائے قیامت کس قسم کی ترکیب ہی؟ معنی کے اعتبار سے اس کی بے پناہی پر روشنی ڈالیے۔

یہ کلیہ ہی کہ شعر و ادب میں بیانِ واقعہ سے بالعموم واقعہ کا اظہار و بیان مقصود نہیں ہوتا بلکہ وہ اثرات و کیفیات مطلوب و مراد ہوتے ہیں جو الفاظ کی تراکیب اور ان کے زیر و بم میں مضمر ہوتے ہیں۔
نیز شاعر کا کمال ہی یہ ہی کہ وہ اپنے مدعا کو اس خوبی سے ادا کر دے کہ اثر کا نشتر پیوست ہو جائے اور کیفیات کا مرقع سامنے نظر آنے لگے لہٰذا وہ اس مدعا کو حاصل کرنے کی غرض سے اکثر و بیشتر ایسا نہج اور اسلوب اختیار کرتا ہی جو کامیابی کے لیئے خضرِ راہ بن سکے خیال چہ مجاز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ اور صنائع و بدائع کے استعمال کی اصل بنا یہی ہی۔
اس کے سوا کائنات کی نبض شناسی اور فطرتِ انسانی کی صحیح صحیح ترجمانی شاعر کا فریضہ ہی۔
لہٰذا شاعرِ معجز بیان کو اپنے ذہن کی رسائی اور وسعتِ معلومات کی بنا پر یہ بات پہلے ہی سے معلوم تھی کہ محبوب کے خرامِ ناز سے عاشق کے

دل کی دنیا محشرستان بن جاتی ہے۔ اور دل پر جو گزرتی ہے اس کے بیان سے زبان بھی قاصر ہے میر ممنون فرماتے ہیں ؎

آہ سے تری۔ ہم پہ جو ہونی تھی ہو چکی!
اب دغدغۂ محشر نہ پروائے قیامت

وہ اس سے بھی واقف تھا کہ روزِ قیامت کی نفسی نفسی اور میدانِ حشر کی پُر آشوبی زبان زدِ خلائق اور عام بات ہے۔

لہٰذا اس نے یہ مناسب خیال کیا کہ اگر محبوب کے خرامِ ناز کو قیامت کے ہوش ربا واقعہ سے تعبیر کیا جائے تو چوں کہ وجہ شبہ معقول ہے اس لیے کلام زوردار بھی ہو جائے گا۔ اور پُر اثر و عام فہم بھی۔ اور یہ کلیہ ہے کہ کلام جس قدر پُر زور اور عام فہم ہوتا ہے۔ اتنے ہی جلد اثر بھی کرتا ہے اور اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ گویا کہ اس میں کامیابی کا راز بھی مضمر ہے۔ اور اس نے ان ہی وجوہ سے محبوب کے خرامِ ناز کو واقعۂ قیامت سے تشبیہ دی ہے۔

اور نہ صرف یہی بلکہ اس جذبے کی کیفیت کو ابھارنے اور جگمگانے کی غرض سے لفظ قیامت کو غوغا کے ساتھ مرکب کیا اور واقعہ کی بے پناہی اور پُر آشوبی کو دو آتشتہ کرنے کے لیے اس مرکب پر پھر ایک صفت کا اضافہ کیا اور لفظِ شورش سے ترکیب دیا۔ جس سے یہ مرکب ایسا پُر زور ہو گیا کہ قیامت کا ہیبت ناک منظر آنکھوں کے سامنے ہو بہو آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کے رُوح فرسا تصور سے دل میں وہ کیفیت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ جو ایک دردمند عاشق کے دل پر محبوب کے خرامِ ناز سے

گزرتی ہی۔ لہٰذا اگر اس مرکب کو شعر کی جان اور شاعر کا کمال سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور فی الحقیقت یہی جزو جملہ ہی جس نے شعر کو شعر بنا دیا ہی کہ دل مزے لینے لگتا ہی۔ خواجہ آتشؔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

ہاں! یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہی کہ اس مرکب میں "شورش" اور "غوغا" جو مضاف واقع ہوے ہیں۔ اگرچہ عام ہیں۔ لیکن چوں کہ مضاف الیہ کی وجہ سے ان میں خصوصیت پیدا ہوگئی ہی۔ یعنی خاص وہی شور و غل جو قیامت سے بالخصوص متعلق ہی نہ کوئی اور ـــ اور قاعدہ ہی کہ وہ ترکیبِ اضافی جس میں مضاف اپنے مضاف الیہ کی وجہ سے خصوصیت حاصل کرلے اور تملیکی یا ظرفی نہ ہو تو اس کو مرکب تخصیصی کہتے ہیں۔ لہٰذا اس مرکب میں بھی دونوں اضافتیں تخصیصی ہی ہیں۔ جن کی تخصیص نے شعر کی لطافت میں اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اور شعر کو سرتاپا کیف کا مرقع بنا دیا ہی۔ جو شاعر کا غیر فانی کمال ہی۔

(۱۴)

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ "چلا میں"

ساغر کی کیا شکل ہوتی ہے؟ ان کی آنکھ اور ساغر میں کیا مناسبات ہیں؟
"چلا میں!" کی تشریح کرو۔

ساغر کی شکل

"ساغر" شراب کے پیالے کو کہتے ہیں۔ اور پیالہ گول اور مدوّر ہوتا ہے۔ نیز ترکوں کی آنکھیں گول ہوتی ہیں، اور اصطلاح میں ترک محبوب کو کہتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں۔

نکتہ۔ آنکھ کی تشبیہ نرگس سے عام ہے۔ لیکن نرگس کو دیکھا تو اس کا پھول ایک گول سی کٹوری ہوتی ہے جس کو آنکھ سے مناسبت نہیں۔ تفحص سے معلوم ہوا کہ ابتدائے شاعری میں ترک معشوق تھے۔ ان کی آنکھیں چھوٹی اور گول ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر قدما آنکھوں کے چھوٹے ہونے کی تعریف کرتے ہیں ع بتِ تنگ چشم اندر آغوشِ تنگ۔
(شعر العجم جلد چہارم باب دوم ص ۱۸۲ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء)

آنکھ اور ساغر میں مناسبت

(۱) آنکھ اور ساغر میں مناسبت کی اصل وجہ تو علامہ شبلی نے واضح فرما دی ہے! اور اگرچہ اصل علت معدوم ہو گئی۔ لیکن تشبیہ بدستور برقرار رہی۔ اس کے علاوہ چند اور مناسبات بھی ہیں:۔
(۲) آنکھ کے گلابی ڈورے اور ساغر میں بادۂ رنگیں کی موجیں۔

(۳) ساغر کا دور اور آنکھ کی گردش۔ میر مہدی مجروحؔ فرماتے ہیں ؎

ساقی کی چشم مست کا گردِ دور ہی یہی
زاہد کو آج کل ہی میں مے خوار دیکھنا

(۴) ساغرِ شراب کی جاذبیت اور ان کی آنکھ کی کشش۔ حکیم ثنار اللہ فراقؔ فرماتے ہیں ؎

دل تھا متنا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

(۵) ساغرِ شراب کی سرمستی اور آنکھ کی میگونی اور متوالاپن۔

الغرض اس قسم کی بے شمار مناسبات ہیں جن کی بنا پر ساغر کو ان کی آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

"چلا میں" کی تشریح

اس شعر میں یہ جملہ شعر کی جان ہے۔ جس سے شعر کی تاثیر تیز ہو گئی ہے۔ اور مستانہ کیفیت پڑھنے اور سننے والوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ سرمستی اور بے خودی کے عالم میں پہنچ جاتے ہیں اور عجب کیفیت سے لذت یاب ہونے لگتے ہیں۔ خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں :۔

"ساغر شراب کو دیکھ کر معشوق کی نشیلی آنکھ کے تصور سے بے خود ہو جانا قرینِ قیاس ہے۔.......................

.........."چلا میں" نہیں معلوم کہ آپے سے چلا۔ یا دین و دنیا سے چلا یا جگہ سے چلا، یا کہاں سے چلا۔ اور سب سے بڑی بات

یہ ہر کہ چلائیں ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے کہ جب آدمی مدہوش اور بدحواس ہو کر گرنے کو ہوتا ہے۔"

(مقدمہ شعر و شاعری صت ۱۴۳)

ایک ہم عصر اہل قلم نسیم صاحب رقم طراز ہیں :-

اس میں ایسا جادو ہے کہ عاشق تو عاشق ہی ہے۔ سننے والے اس کی کیفیت سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ اگر ڈگمگا کر گرنے کی حد تک نہیں پہنچتے تو وجد میں آکر جھومنے تو لگتے ہی ہیں۔ عجب نقشہ ہے اور عجب کیفیت ہے جو اس سے بہتر الفاظ میں ادا ہی نہیں کی جا سکتی۔

بیخودی کا عالم طاری ہو چلا ہے ہوش اور مدہوشی کے درمیان بس اتنا ہی وقفہ .... ہے کہ عاشق یہ دونوں الفاظ اپنی اینٹھتی ہوئی زبان سے ادا کر سکے۔ اس آواز کے بعد وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہے گا۔ بے ہوشی اس پر طاری ہو گئی ہے اور اسے اتنا موقع بھی نہیں مل سکا کہ اس کیفیت کو زیادہ واضح کر سکے۔ ان سب حالات و واردات کو ایک چلائیں کا مختصر سا جملہ ادا کر رہا ہے۔

درحقیقت یہ شاعر کا معجزہ اور سحر ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔"

(ماہ نامہ عالم گیر لاہور صت ۲۱ مارچ ۱۹۳۳ء)

یہ ہے چلائیں کی تشریح۔ جس کی دراصل کامل وضاحت نہیں کی جا سکتی ہے۔ بہر کیف یہ جملہ شعر کی جان ہے۔ اور فصاحت و بلاغت اس پر ہزار جان سے نچھاور ہے۔ ایسے جملوں کا زبان سے نکل جانا اور برمحل نظم ہو جانا۔ شاعر کی کہنہ مشقی اور زبان دانی کی دلیل ہے۔

(۳)

یہ بے سبب نہیں کہ جو مٹتے ہیں سینکڑوں دل
کچھ اور بھی تو ہی۔ ترے نقشِ قدم کے ساتھ
کچھ اور میں کیا کیا کچھ ہی؟

یہ تو صحیح طور سے بتایا ہی نہیں جا سکتا کہ شاعر کے پیشِ نظر "کچھ اور" میں کیا کیا کچھ ہی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہی ؎

یوں تو کہنے کو نقشِ پا کہیے
جو حقیقت ہی اس کو کیا کہیے

البتہ ہماری رائے میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہی کہ "ای محبوب یہ جو سینکڑوں دل پامالِ خرامِ ناز ہوتے اور مر مٹتے ہیں اس کے اسباب تو واضح ہیں کہ تمھارے خرامِ ناز کی شوخی اور دل ربائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں۔

لیکن اس کے علاوہ بھی ان کے مر مٹنے کا ایک اور سبب ہی اور وہ تمھارے نقشِ پا سے وابستہ ہی۔ اور وہ یہ ہی کہ جو لوگ خرامِ ناز سے پامال اور فرشِ راہ ہوتے ہیں تو ان کی خاک پر تمھارے نقشِ قدم کا ثبت ہونا بھی قرینِ قیاس ہی اور یہ قاعدہ ہی کہ جہاں تمھارا نقشِ قدم ہوتا ہی۔ وہ جگہ سجدہ گاہِ خلائق بن جاتی ہی۔ خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد شد

گویا کہ مٹنے والے تمھارے نقشِ قدم کی بدولت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سجدہ گاہِ خلائق بن جاتے ہیں اور انھیں حیاتِ ابدی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور ان کی منزلت اور ان کی توقیر میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ع

میرے مرنے کا تماشا دیکھنے کی چیز ہے

کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

افتادگانِ خاک کے رتبے کو دیکھیے
بادِ صبا ہے غاشیہ بردوشِ نقشِ پا ....

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خراماں خراماں ارم دیکھتے ہیں

بہر حال "کچھ اور ہیں" بہت کچھ ہے۔ اور ایسا کچھ ہے کہ جس کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ ایسا سیدھا سادہ اور اتنا معنیٰ خیز جملہ بلاغتِ کلام اور شاعر کی وسعتِ نظر اور مشق و مہارت اور قدرتِ کلام کی روشن دلیل ہے۔ اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ جو شاعر کو اعلیٰ درجے کا شاعر منوائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

نقد و نظر

(موازنہ)

وہ بے وفا نہ آیا بالیں پہ وقتِ رفتن   سو بار ہم نے دیکھا سر کو اٹھا اٹھا کر
(میرؔ)

نزاع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار   جانبِ در دیکھ لے ہے جب کہ ہوش آجائے ہے
(ذوقؔ)

اب بھی نہیں جاتی ترے آجانے کی امید   گو پھر گئیں آنکھیں پہ نگہ جانبِ در ہے
(مومنؔ)

یہ تین شعر تین خداوندانِ سخن کے ایک ہی مضمون پر ہیں لکھیے کہ کون سے شعر میں زیادہ حلاوت ہے؟

میں نے ان تینوں شعروں کو پڑھا، سمجھا، اور اپنے ذوق کے مطابق لطف اندوز بھی ہوا۔ فی الواقع ہر شعر میں خاموش سحر اور جگر سوز افسوں پنہاں ہے کہ جو دل کے بحرِ ناپیدا کنار میں تلاطم برپا کیے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن ہر ایک کا انداز جدا اور لطف جدا ہی ہے۔

مومن کا ترنم اور دل آویزی اور در کی طرف دیکھتے ہی دیکھتے دم نکل جانا اور آنکھوں کا پتھرا کے ٹھہر جانا وہ خوش گوار مبالغہ ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ اس کے

سننے اور پڑھنے سے وہ کیف طاری ہوتا ہے کہ سر دھنتے ہی بن پڑتی ہے۔

ذوق کا شعر بھی نہایت پُر ذوق ہے۔ پہلے مصرعے کے آخری جزو "تیرا ہی بس ہے انتظار" میں "بس" اور دوسرے کے آخری جزو "عجب کہ ہوش آجائے ہے" میں ہوش دو ایسے بے مثل لفظ جمع ہو گئے ہیں کہ جو ان کی مشاقی اور استادانہ دقیقہ سنجی کے مرہونِ منت اور ان کے کمال کے ترجمان ہیں! درفی الحقیقت یہی دو لفظ ہیں جن سے شعر کو چار چاند لگ گئے ہیں! اور کوئی شئے مانع نہیں کہ اس شعر کو دیگر اشعار پر ترجیح نہ دی جائے مگر حق یہ ہے کہ جائے استاد خالی است۔

میر صاحب کے کلام کی گھلاوٹ۔ صفائی۔ سادگی روانی اور سب سے بڑھ کر دردمندی اور حسرت خیز ترنم اللہ اللہ! سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو تڑپانے اور برمانے کے لیے جادو کا اثر رکھتا ہے۔

ان کی سحر بیانی اور ترنم دلوں کو ہلا دیتا ہے اور کائناتِ دل کو محشرستان بنا دیتا ہے! اور ایسا متاثر کرتا ہے کہ دل دنیا کی بے ثباتی اور بے مہری سے بے مزہ ہوتا اور سرد پڑجاتا ہے ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

اور کیوں نہ ہو میر صاحب یاس وحسرت کے پتلے اور غم و اندوہ کے مجسمے تھے درد و غم سے ان کا خمیر تھا اور دردمندی اور شکستہ حالی ان کی طینت میں شامل تھی چناں چہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان ہوا

لہٰذا جو لفظ ان کی زبان سے نکلتا ہے غم واندوہ کا جنازہ نکلتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ غم والم

کے مرثیے، شادی وطرب کے نغموں سے زیادہ موثر اور جگر خراش ہوتے ہیں۔ اور ان کا
اثر بھی نسبتاً دیرپا اور کارگر ہوتا ہی کسی نے کیا خوب کہا ہی ؎

حدیثے درد۔ دل آویز داستانے ناست که ذوقِ بیش دہد چوں دراز تر گردد

پھر میر صاحب کی زبان سے جو سراپا درد تھے ع

درد مندی میں کٹی ساری جوانی اس کی

اس کے ذوق واثر کا کیا ٹھکانا۔ اللہ کی پناہ!! کہاں سے کوئی دل لائے
جو شعر کا تجزیہ کرکے بتائے کہ ہر لفظ بذات خود ایک افسانۂ الم ہی۔ دیکھیئے پہلے مصرع
کا یہ جملہ "وہ بے وفا نہ آیا"۔ کتنا دردناک ہی کہ "بے وفا" کا لفظ موبنھ سے نکلتے ہی
دل تلملا اٹھتا ہی اور غم واندوہ کا بے پناہ نشتر کلیجے میں پیوست ہوجاتا ہی! اور سننے والا
ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہی اور پہروں یہی عالم رہتا ہی۔

پھر حسرت کے ساتھ یہ کہنا "سو بار ہم نے دیکھا" یہ بتا رہا ہی کہ وعدہ خلاف
محبوب سادہ دل عاشق کو جُل دے کر گیا ہی اور وفا کا مارا عاشق انتظار ہی انتظار
میں جل بسا اور آخر دم تک اسے یہی آس رہی کہ اب آیا اور اب آیا مگر اسے نا تھا اور نہ آیا۔
ہائے!! کیا حسرت کی گھڑی اور کیسی عبرت کی موت ہی کہ دم آنکھوں میں آگیا ہی اعضا
شکنی ہو رہی ہی۔ مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہی۔ لیکن آس لگی ہوئی ہی اس کے آنے کا انتظار
ہی اور کوئی سدھ بدھ نہیں۔ ہوش وحواس پرّان ہیں۔ مگر جب توانائی سہارا دیتی ہی
سر کو اٹھا کر دیکھ لیتا ہی کہ محبوب نے وعدہ وفا کیا یا نہیں۔

سچ ہی جو خود اتنا وفادار ہو۔ اسے ضرور ایفائے عہد کا اتنا ہی یقین ہونا
چاہیے۔ مگر کیا ہی کیا جائے کہ حسینوں کی قوم ہوتی ہی بے وفا ہی۔ مرزا غالب

انھیں خوب سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

بہرحال یہ امتیازات ہیں۔ جن کی بنا پر میرے نزدیک میر صاحب کا شعر دیگر خداوندانِ سخن کے اشعار پر ترجیح رکھتا ہے۔ حال آں کہ میر صاحب کے شعر میں قدامت بھی ہے، جو وقتِ رفتن کی صورت میں جلوہ گر ہے اور جو ان کے عہد کا طرۂ امتیاز ہے۔ تاہم شعریت تاثر کے اعتبار سے میر صاحب ہی کا شعر ممتاز ہے۔

تنقید

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

ایک ایسی مختصر تنقید کیجیے جس میں کوئی فقرہ غیر ضروری نہ ہو۔ نیز بتائیے کہ لفظ درد یہاں درست ہے یا نہیں؟

اس شعر میں صرف دو باتیں تنقید کے لائق ہیں:۔
(۱) زخم کا ٹانکا کھلنا۔ (۲) دل میں درد ہونا۔
(۱) ٹانکا کھلنا محاورہ نہیں بلکہ ٹانکا ٹوٹنا محاورہ ہے جیسا چہ خواجہ آتش فرماتے ہیں ؎ خون ہو جاتا ہے دل کیا دیدۂ تر خشک ہو
روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں زخم کیوں کر خشک ہو

اور یہ مسلم ہے کہ جو کلام خلافِ محاورہ ہوتا ہے اس کی کوئی منزلت نہیں ہوتی۔
(۲) دل میں درد ہونا صحیح نہیں۔ کیوں کہ اس سے مراد دل کے زخم کا درد ہے۔

اور جو درد کسی زخم میں ہوتا ہی۔ اسے ٹیس یا چپک کہتے ہیں۔ چناں چہ شیخ ناسخ فرماتے ہیں ؎

اُٹھنے لگی ہی کیوں مرے زخم کہن میں ٹیس
آتی ہی شاید آج ہوا کوے یار کی.....

بہرحال ان دونوں مصرعوں میں عیبِ کلام ہی۔ جسے ضعفِ تالیف سے تعبیر کیا جاتا ہی اور بس۔

مضامین کی حدود کے خاکے

(۱) چھاپہ خانہ

۱۔ فن تحریر کی ایجاد اور قدیم زمانے میں تحریر کے لیے استعمال ہونے والی چیزیں۔ دھاتیں، درختوں کی چھال، جانوروں کی کھالیں ....

۲۔ کاغذ کی ایجاد اور چھاپے کا خیال۔ اس کے موجد چینی ہیں۔ بعد میں جرمنی کے ایک شخص گوٹنبرگ نے لکڑی کے حرف بنا کر چھپائی کا کام شروع کیا۔ اس طرح مختلف تجربے ہوتے رہے۔

۳۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں سیسے کے حروف بنائے گئے لیکن یہ ٹائپ کا پریس تھا چینیوں کی صنعت لیتھو سے متعلق تھی۔ اس پر یورپ میں مزید تجربے ہوئے اور پہلے پہل ایک دستی پریس تیار کیا گیا۔ یورپ سے پریس کا ہندوستان آنا۔

۴۔ دستی پریس:۔ بھاپ کے ذریعہ کلوں سے چلنے والے پریس۔ بجلی سے چلنے والے پریس، مگر خرچ بہت آتا تھا اور لاگت زیادہ بیٹھتی تھی۔

۵۔ زمانۂ حال کے پریس:۔ پریس نے بہت جلد اپنی شکلیں بدلی ہیں۔ مونوٹائپ لائنوٹائپ اور روٹری مشین۔ یورپ میں ایسے ایسے پریس ہیں کہ کاغذ لگانے سے کتاب بننے تک کا سارا کام مشین ہی کرتی ہے۔

۶۔ سستی چھپائی سے علم کی فراوانی۔ پریس کے موجد نے بنی نوعِ انسان پر بہت بڑا احسان کیا

(۲) دیوالی

۱- ہندوؤں کے تہواروں کا مختصر سا تذکرہ اور ضمناً دیوالی کا بیان۔
۲- وجہ تسمیہ اور تاریخ۔ اصل میں دیپا والی تھا۔ دیپا ہندی میں دیے یعنی چراغ کو کہتے ہیں۔ رام چندر جی کے لنکا پر فتح پانے کے بعد اجودھیا میں داخل ہونے کے موقع پر اہل شہر نے جو چراغاں کیا، یہ اسی کی یادگار ہے۔ عام طور پر نومبر کے مہینہ میں منعقد ہوتی ہے۔
۳- ہر ہندو اپنی حیثیت کے مطابق اس خوشی میں چراغاں کرتا ہے۔ لیکن اب اس میں قمار بازی کو بھی داخل کر لیا گیا ہے۔ بعض ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ اس رات جس کو کامیابی ہو گی وہ سال بھر کامیاب رہے گا۔ اس کی بری اور قبیح شکلیں،
۴- اصل مقصد سے ہٹ جانے کے نقصانات۔

(۳) ہولی

۱- ہر ملک میں کھیل تماشے تفریح طبع کے لیے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ تہوار تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔
۲- پھاگن کے پندرہ بیس روز گزرنے پر اس کی تیاریاں شروع ہوتی ہیں اور جب پورن ماشی میں دو چار روز رہتے ہیں تو شہروں، قصبوں اور گانوؤں میں ہر جگہ اس کی چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔

۳- ناچ گانے۔ سوانگ اسی طرح کے مناظر۔ فحش پن۔ اور بیہودگی کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

۴- عین پورن ماشی کے موقع پر اُپلے۔ لکڑیاں جمع کر کے رات بھر آگ جلاتے ہیں اور اس کو ہندو لوگ مذہبی رنگ دے کر اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں۔

۵- اگلے روز دوپہر کو نہا دھو کر کسی باغ کی سیر کو جاتے ہیں۔ دوستوں اور عزیزوں سے ملتے ہیں۔ اس کو دلہنڈی کہتے ہیں۔

(۴) بسنت رُت

۱- بسنت کی آمد آمد۔ نئے نئے پھول اور پتے۔ نباتات پر بہار کی عام کیفیت۔

۲- یہ بھی ایک قومی تہوار ہے۔ لیکن ہندوؤں نے اسے مذہب سے وابستہ کر رکھا ہے۔ مرد پیلی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ اور عورتیں اور لڑکیاں پیلے دوپٹے اوڑھتی ہیں اور اس رنگ کو بھی بجائے پیلے کے بسنتی کہا جاتا ہے۔

۳- عزیزوں اور دوستوں سے ملاقاتیں۔ ایک دوسرے کو تحفہ تحائف۔

۴- مجالسِ رقص و سرور منعقد کی جاتی ہیں۔

(۵) میونسپلٹی

۱- شہروں اور قصبوں میں جو پنچائیتیں ہوتی ہیں ان کو میونسپل بورڈ یا میونسپل کمیٹی کہتے ہیں۔

۲- انتخاب کا طریقہ۔

۳۔ سب کمیٹیاں :۔ (۱) امور عامہ (۲) صحت اور صفائی (۳) تعلیم۔
(۴) مالیات وغیرہ۔ سکریٹری اور ماتحت عملہ۔
۴۔ آمدنی :۔ چنگی حیثیت ٹیکس۔ جائداد ٹیکس۔ واٹر ٹیکس وغیرہ۔
۵۔ پبلک کا تعاون عملہ کمیٹی سے پورا پورا ہونا چاہیے ورنہ کمیٹی کا کچھ فائدہ نہیں۔ اپنی جائز شکایات کو رفع کرانا چاہیے۔

(۶) دیہاتی میلہ

۱۔ کام کرتے کرتے انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ تو وہ طبعاً کسی اور مشغلے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ دیہاتی بھی جب اپنے کاروبار مثلاً کھیتی باڑی وغیرہ کے کام سے اکتا جاتے ہیں تو میلے منعقد کرتے ہیں۔
۲۔ عام طور پر میلوں میں شامل ہونے کی غرض تفریح طبع ہوتی ہے لیکن بعض لوگ محض روپیہ پیسہ جائز ناجائز حیلوں سے کمانے کے لیے شرکت کرتے ہیں۔
۳۔ میلے ضروری اشیا کی خرید و فروخت کے لیے بھی اچھا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔
۴۔ دیہاتی میلوں کے مختلف مناظر۔

(۷) قطب کی لاٹھ

۱۔ اس عمارت کی رفعت و شان، بلندی و خوش نمائی احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ روئے زمین پر اس کی مثال نہیں۔

۲- اب اس کی تین سو اٹھتر سیڑھیاں اور پانچ منزلیں ہیں۔ کل اونچائی ۸۰ گز ہے جب اس کی ساتوں منزلیں قائم تھیں تو کل اونچائی سو گز تھی۔ سیڑھیاں چکردار ہیں۔ لاٹھ کا محیط سطح زمین سے پچاس گز ہے۔

۳۔ تمام تر سنگِ سُرخ کی بنی ہوئی ہے البتہ چوتھی منزل میں سنگِ مرمر لگا ہوا ہے۔

۴- اس کا بانی سلطان شمس الدین التمش تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سلطان معز الدین کی لاٹھ ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ہندوؤں نے بنائی اور قطب الدین نے جس کے نام سے یہ لاٹھ بعد میں مشہور ہوئی۔ مورتیاں نکلوا کر ان کی جگہ آیات کندہ کرا دیں۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ مسجد کا ماذنہ (اذان دینے کا مقام) ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اس کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں بنے۔

سنہ ۱۸۲۹ء میں انگریزی حکومت نے اس کی مرمّت کرائی۔ لیکن اس مرمّت میں الفاظ کی صورت مسخ ہو گئی۔

۵- سرسید نے آثار الصنادید میں کتبوں کی عبارت نقل کی ہے۔

۶- لاٹھ کے گرد و نواح کی عمارتیں۔

۷۔ علائی دروازہ اور علاء الدین خلجی کے اضافے۔

۸۔ مناظرِ قدرت اور لاٹھ کا منظر۔

(۸) اکبر بادشاہ

۱۔ ہندوستانی مسلمان بادشاہوں میں سب سے بڑا۔ جلال الدین محمّد نام۔

۲۔ امرکوٹ (پنجاب) کے مقام پر ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو ایسے وقت میں پیدا ہوا جب اس کا باپ ہمایوں جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔
۳۔ بچپن سے شہ سواری، تیر اندازی کا شوق تھا۔ شکار کا شوقین اور ان پڑھ تھا۔
۴۔ سترہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ان پڑھ تھا لیکن اپنے وزرائے باتدبیر کی مدد سے ایسے آئین و قوانین بنائے کہ اس کا احسان ہندوستان ہی پر نہیں سب بنی نوعِ انسان پر ہے۔
۵۔ اکبر کے نورتن۔
۶۔ ہندوؤں سے رشتے ناتے قائم کیے اور ان سے شیر و شکر ہو گیا۔ اسی بنا پر بہت ہر دل عزیز رہا۔
۷۔ عادات و خصائل۔ ابتدائے جوانی میں مے نوشی کا عادی تھا لیکن پھر متقی اور پرہیز گار ہو گیا۔ سال میں تین مہینے گوشت سے پرہیز۔ شب بیداری مباحثِ علمیہ کا شوق۔ سیر و شکار سے محبت۔ ایجادات وغیرہ۔

(۹) علامہ اقبال

۱۔ پیدائش پنجاب کے ایک مشہور مقام سیالکوٹ ۱۸۷۵ء میں۔
۲۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر میں۔ علم و ادب سے خاص لگاؤ۔ شمس العلماء مولوی سید میر حسن جیسا لائق اور مہربان استاد۔ زمانۂ طالب علمی میں شعر و سخن کا شوق نواب مرزا داغ دہلوی سے غائبانہ شرفِ تلمذ۔
۳۔ بی اے کے لیے لاہور۔ پروفیسر آرنلڈ جیسا شفیق استاد۔ استاد کا ولایت

جانا اور شاگرد کا پیچھے پیچھے جانا۔ قابل استاد سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ اس بارے میں اقبال کا اعتراف :۔ "جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا، اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔"

۴۔ یورپ میں کئی قابل آدمیوں سے مستفید ہونے کا موقع۔ بیرسٹر ایٹ لا بن کر وطن واپس آئے۔ شاعری کو جلا دی۔

۵۔ لاہور میں کالج کی ملازمت۔ بیرسٹری نہیں کی۔ ملازمت سے دست برداری۔ "سر" کا خطاب۔

۶۔ کلام مقبولِ عام ہے۔ یورپی زبانوں میں تراجم۔ "بانگِ درا" پہلا اردو مجموعہ "اسرارِ خودی"۔ "رموزِ بے خودی"۔ "پیامِ مشرق"۔ "زبورِ عجم"۔ "بالِ جبریل"۔ "ضربِ کلیم"۔ "مسافر"۔ "ارمغانِ حجاز"۔

۷۔ اپنے زمانہ کا بہت بڑا مفکر۔ قوم کو بیداری کا پیغام۔ قلوب کو گرمایا۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں انتقال۔ لاہور کی شاہی مسجد میں مدفن۔ مدفن کا منظر۔

۸۔ کلام کی خصوصیت۔ اور کلام کا نمونہ۔

(۱۰) اکبر الہ آبادی

۱۔ سید اکبر حسین نام۔ اکبر تخلص۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اردو فارسی میں اچھی دسترس ہو گئی۔

۲۔ معمولی ملازمت سے ترقی کرتے کرتے سیشن ججی کے عہدے تک پہنچے۔

خان بہادری کا خطاب اور ۱۹۰۳ء میں پنشن۔

۳۔ گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ سرشار، شرر اور چکبست کے ہم عصر۔ مشرقی تہذیب کے پرستار تھے۔

۴۔ کلام میں ظرافت غالب تھی۔ مغربی تہذیب کی طرف سے لوگوں کو ہٹانا چاہتے تھے۔ جذبات سادہ اور لطیف تھے۔ تخیل پاکیزہ تھا۔ اور تصوف کی طرف میلان طبع تھا۔

۵۔ ان کا مجموعۂ کلام "کلیاتِ اکبر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

۶۔ کلام کا نمونہ۔

(۱۱) ڈاکٹر مولوی عبدالحق

۱۔ ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ابتدائی تعلیم پنجاب اور یو۔ پی میں ہوئی علی گڑھ سے بی، اے کیا۔ اور حیدر آباد پہنچ گئے۔ مدرسہ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقیٔ اردو وجود میں آئی۔

۲۔ انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ اس کے بعد اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوئے وہاں انجمن ترقی اردو کی معتمدی بھی سنبھالی۔ وہاں سے پنشن پاکر حیدر آباد آ گئے۔ نظام دکن کی تحریک پر جامعہ عثمانیہ میں اردو کے صدر ہوئے۔

۳۔ ۱۹۳۸ء کے آخر میں انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوا تو مولوی صاحب بھی اس کے ساتھ یہاں آ گئے۔

۴۔ پیرانہ سالی کے باوجود صحت اچھی ہے اور ان تھک کام کرتے ہیں۔ مولوی

صاحب پہلے تو محض علمی کام کیا کرتے تھے۔ اب کئی سال سے علمی کام کے ساتھ ساتھ تنظیمی کام بھی کر رہے ہیں۔

۵۔ ذاتی تصانیف بہت کم ہیں البتہ بہت سی کتابوں پر بہت بلند پایہ اور بسیط مقدمات لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض بے تکلف دوست انھیں مزاحاً "مقدمہ باز" کہتے ہیں۔

۶۔ جوہر عبدالحق جامعہ ملیہ دہلی کے خاص نمبر میں آپ کے سوانح حیات ہے۔

۷۔ تحریر میں حالی کے پیرو اور بہترین انشا پرداز ہیں۔

(۱۲) لباس

۱۔ لباس کی ضرورت۔ ۲۔ لباس کی اصلی خوبی۔

۳۔ مختلف قوموں کے لباس میں اختلاف

۴۔ مختلف طبقوں کے لباس کا فرق۔

۵۔ عورتوں اور مردوں کے لباس میں امتیاز۔

(۱۳) تحریر و تقریر

تحریر:۔ بڑی دیرپا چیز ہے۔ دُور دُور پھیل سکتی ہے۔ پچھلوں کے حالات تحریر ہی کے ذریعے ہم تک پہنچے۔ ہمارے کارنامے آیندہ نسلوں تک تحریر ہی سے پہنچیں گے۔ لیکن اس سے اَن پڑھ لوگ بہت کم مستفید ہو سکتے ہیں۔

تقریر:۔ دلوں کو گرماتی ہی۔ حاضرین پر اس کا بڑا اثر ہوتا ہی۔ مقرر اپنے لب و لہجہ سے سامعین کو مسحور کر سکتا ہی۔ تاریخ شاہد ہی کہ تقریر نے قوموں کی کایا پلٹ دی، بزدلوں کو دلیر۔ اور دلیروں کو دلیر تر بنا دیا۔ لیکن اس کا اثر محدود اور عارضی ہوتا ہی۔

(۱۴) اخبار بینی

۱۔ اخبار بینی کی عادت قابلِ تعریف ہی۔ گھر بیٹھے اپنے اردگرد کے حالات معلوم ہوتے ہیں اور دیگر ملکوں کی خبریں حاصل ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسرے ملکوں کی تہذیب و معاشرت، صنعت و حرفت، فلاحت و تجارت، تعلیم و تربیت، سیاسیات و معاشیات کا حال معلوم ہوتا ہی۔

۳۔ مشاہیرِ عالم کے کارنامے اخبار کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں اور ان سے پڑھنے والوں میں اُولوالعزمی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

۴۔ اشتہارات کا بہترین ذریعہ اخبارات ہیں۔

۵۔ دل کو بہلانے اور وقت گزاری کا نہایت عمدہ مشغلہ۔

۶۔ اخبار بینی سے زبان دانی میں بڑی مدد ملتی ہی۔

(۱۵) صنعت و حرفت

۱۔ صنعت و حرفت سے کیا مُراد ہی؟

۲۔ اہلِ حرفہ آزاد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے مالک ہوتے ہیں۔

۳۔ کسی ملک کی ترقی کا راز اس کی صنعت و حرفت کی ترقی میں مضمر ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مثالیں۔ ایشیائی ممالک کی مثالیں۔
۴۔ ہندوستان کی صناعی کی مثالیں۔ قدیم صنعتوں کی تباہی اور اس کے اسباب۔
۵۔ از سرِ نو ان صنعتوں کو زندہ کرنے اور ان کو فروغ دینے کے وسائل۔
۶۔ صنعت و حرفت فی الحقیقت ایک کیمیا ہے۔

(۱۶) ہندوستان کے موسم

(ا) بہار :۔ درختوں کا منظر۔ انسانوں میں نیا خون۔ چرند پرند سبھی خوش۔ ہندوستان کے پارسی آغازِ بہار میں نوروز مناتے ہیں لیکن افسوس! یہ موسم بہت تھوڑے عرصے رہتا ہے۔

(ب) گرمی :۔ بلائے جان۔ سورج کی تیزی۔ زمین کی تپش۔ لوئیں اور آندھیاں حبس اور پسینہ۔ انسان اور حیوان سب ہی اس موسم سے پناہ مانگتے ہیں۔

(ج) برسات :۔ آسمان پر بادل۔ ہلکی ہلکی پھوار۔ موسلا دھار مینہ۔ جل تھل کا عالم۔ جنگل میں منگل۔ انسان بھی خوش اور حیوان بھی خوش۔ سب سے زیادہ خوشی نباتات کو۔

(د) جاڑا :۔ غربا کی مصیبت، امرا کی راحت، دن چھوٹے۔ راتیں بڑی۔ درخت لنڈ منڈ۔ لوگ نزلے اور کھانسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن سخت سے سخت محنت کے کام اسی موسم میں ہو سکتے ہیں۔

(۱۷) مُردم شماری

۱۔ مُردم شماری کیا چیز ہی۔ ہندوستان میں ۱۸۸۱ء سے ہر دس سال کے بعد ہوتی ہو۔
۲۔ حکومت کو اس کی ضرورت۔ رعایا کو اس کی حاجت۔ پچھلی تعداد سے مقابلہ کمی بیشی کی وجوہ اور اس کا انسداد۔
۳۔ مُردم شماری تاریخ کا جز بنتی ہی۔ آنے والی نسلیں اس سے مطلع ہوتی ہیں۔
۴۔ فوائد:۔ مختلف قوموں کی تہذیب و ترقی، تعلیم و تربیت، صحت، صحت عامہ اور خواندگی کا حال معلوم ہوتا ہی۔
۵۔ مُردم شماری کا رجسٹر ملک کے جسم کی اناٹمی یا تشریح البدن کی کتاب ہی۔ جس سے ملک کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہی۔

(۱۸) اخبار نویسی

۱۔ یہ ایک شریف پیشہ ہی۔ اچھے اخبار نویس بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔
۲۔ روزی کمانے کے علاوہ ملک کی خدمت کا بہترین ذریعہ ہی۔
۳۔ سیاسیات میں اخبار نویسی کا درجہ۔
۴۔ ہندوستان میں اخبار نویسی لیڈر بننے کی غرض سے اختیار کی جاتی ہی۔ یا محض روزی کمانے کے لیے۔
۵۔ دوسرے ملکوں میں اس کے لیے باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہی۔ لیکن

ہندوستان میں اس کام کے لیے اب تک کوئی ادارہ نہیں۔
۶۔ اخبار نویسی کے لیے وسیع مطالبہ، دقیق مشاہدہ اور عمیق فکر کے ساتھ ساتھ روزی کی طرف سے بے فکری کی بھی ضرورت ہی۔
۷۔ ہندوستان میں یہ فن ابھی یورپ سے بہت پیچھے ہی۔
۸۔ اس فن پر کتابیں بھی بہت کم دستیاب ہوتی ہیں۔
۹۔ فنِ صحافت مطبوعہ انجمن ترقی اردو اس فن پر اچھی کتاب ہی۔

(۱۹) اشتہار نویسی

۱۔ یورپی ممالک میں یہ ایک مستقل فن ہی۔ اور اس کے لیے باقاعدہ ٹرننگ کا انتظام ہی۔ وہاں اچھے اشتہار نویس بڑے بڑے صلے پاتے ہیں۔
۲۔ ہندوستان میں اس فن کو سہل الحصول بنا لیا گیا ہی حالاں کہ اس میں کافی محنت کی ضرورت ہی۔
۳۔ اشتہار نویسی جہاں روزی کمانے کا ذریعہ ہی وہاں تجارت اور بالواسطہ ملک کی خدمت کرنے کا بھی ذریعہ ہی۔
۴۔ اشتہار نویسی کے لیے اطمینان اور یک سوئی کی ضرورت ہی۔
۵۔ اشتہار نویسی کے تین بڑے اصول :۔
(۱) عنوان جاذبِ توجہ۔
(۲) مضمون مختصر اور جامع۔
(۳) ایمان داری۔

(۲۰) اُردُو کی مَوجُودَہ ضرُوریات

اردو بلاشبہ ایک مقبولِ عام اور ہر دل عزیز زبان ہی لیکن اس کو مقبول تر اور پایہ دار تر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہی:-

۱- ایک اعلیٰ درجہ کی نیوز ایجنسی۔ خبریں جمع کرنے اور ان کو بھیجنے کے لیے سلیقہ مند عملہ۔

۲- اعلیٰ پیمانے کا اُردُو پریس۔

۳- اردو ٹائپ کو زیادہ سے زیادہ رواج دینے کے لیے ذرائع پیدا کرنا۔

۴- اردو پڑھانے والے مدرسین کی ٹرینگ کے لیے ایک مرکزی اور کئی صوبائی کالجوں کی ضرورت۔

۵- اردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام۔ اردو یونی درسٹی قائم کرنا۔

۶- ایک جامع لغت (انسائیکلوپیڈیا)

۷- اردو کے معیاری اخبارات و رسائل کی تعداد میں اضافہ۔

۸- اردو میں معیاری کتابیں تصنیف کرانا۔

۹- اردو کے اچھے مصنفین کی حوصلہ افزائی۔

۱۰- اچھی اور معیاری کتابوں کی اشاعت کے لیے ادارے قائم کرنا۔

تذکرۃ المشائخ

سوانح حضرت محبوب الٰہیؒ

حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی مبارک زندگی کے رُوح پرور حالات۔ دینی خدمات۔ رُوحانی مشاغل تبلیغ و ہدایت کے دل نواز کارنامے۔ مؤثر دُعائیں اور مجرّب عملیات۔ وعظ و خطبات اور اقوال زرّیں۔

عہدِ حاضر کے نامور اہلِ قلم اور علماء و مشائخ کی رائے ہے کہ اس کتاب میں پہلی بار حضرت کی زندگی کا صحیح مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اسلوب بیان اس قدر جاذب اور دلکش ہے کہ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ قیمت مجلد دو روپے پچاس پیسے 2-50

دیگر اولیائے کرامؒ کے محققانہ سوانح حیات

سوانح حضرت خواجہ حسن بصریؒ قیمت ۸۰ پیسے
" حضرت شیخ عبدالواحد بصریؒ " ۲۵ "
" حضرت خواجہ فضیل بن عباسؒ " ۴۰ "
" حضرت خواجہ ابراہیم ادھمؒ " ۶۰ "
" شیخ حذیفۃ المرعشیؒ " ۲۰ "
" شیخ ہبیرۃ البصریؒ " ۲۰ "
" خواجہ ممشاد علو دینوریؒ " ۲۵ "
" خواجہ ابو اسحاق شامیؒ " ۲۰ "

سوانح خواجہ ابو احمد ابدال چشتیؒ قیمت ۲۵ پیسے
" خواجہ ابو محمد ابدال چشتیؒ " ۲۰ "
" خواجہ ابو یوسف چشتیؒ " ۲۰ "
" خواجہ مودود چشتیؒ " ۲۰ "
" حاجی شریف زندنیؒ " ۲۵ "
" خواجہ عثمان ہرونیؒ " ۴۰ "
" شیخ ابوبکر طوسیؒ " ۵۰ "
" حضرت بایزید بسطامیؒ زیر ترتیب

مجموعی یکجا مجلد ۵/۷۵

کتب خانہ انجمن ترقی اُردو۔ جامع مسجد دہلی